جمادی الاولیٰ 1433ھ

اپریل 2012ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

"خادمِ اعلیٰ" پنجاب میاں شہباز شریف کے نام

✿

اسلامی خلافت۔ دلیل و قانون کی حکمرانی

ڈاکٹر رفیع الدین فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام

ڈاکٹر محمد رفیع الدین (مرحوم) کی معروف کتاب

قرآن اور علمِ جدید

کا ساتواں ایڈیشن شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا ہے

کتاب کا موضوع

''قرآن اور علم جدید'' ڈاکٹر صاحب کی ایک معرکۃ الآراء تصنیف ہے جو درحقیقت علامہ اقبال کی کتاب ''خطبات'' ہی کے سلسلے کی ایک دوسری کامیاب کاوش ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ناقابل تردید حقائق، دلائل اور مثالوں سے ان تمام فلسفوں اور نظریات کے تار و پود بکھیر دیے ہیں جن کی بنیاد پر آج تک مختلف ممالک میں نظام ہائے حکومت قائم رہے ہیں۔

☆ عمدہ طباعت ☆ خوبصورت ٹائٹل کور ☆ اعلیٰ جلد بندی

☆ 583 صفحات ☆ قیمت 650 روپے

ڈاکٹر محمد رفیع الدین (مرحوم) کی درج ذیل تصانیف بھی دستیاب ہیں:

(1) Ideology of the Future — Price: Rs.500/-

(2) The Quran & Modern Knowledge — Price: Rs.500/-
(قرآن اور علم جدید کا انگریزی ترجمہ)

ہول سیلرز، پبلشرز اور بک سیلرز کے لیے خصوصی تعارفی قیمت

ملنے کا پتہ: ڈاکٹر رفیع الدین فاؤنڈیشن

36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور، فون: 042-35074598

ڈسٹری بیوٹر: پروگریسو بکس، اردو بازار، لاہور، فون: 042-37352795

مشمولات

عرضِ احوال ــــــــــ 3
”خادمِ اعلیٰ“ پنجاب شہباز شریف بن میاں شریف کے نام — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن ــــــــــ 5
سورۃ الانفال (آیات ۲۰ تا ۴۸)
ڈاکٹر اسرار احمد

تعمیرِ سیرت ــــــــــ 25
خوف وخشیت: ایمان کا لازمی تقاضا
عتیق الرحمٰن صدیقی

تذکیر و موعظت ــــــــــ 35
☆ رزقِ حلال کی اہمیت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ
☆ زکوٰۃ وصدقہ — حافظ محمد مشتاق ربانی — 39

بحث و نظر ــــــــــ 43
اسلامی خلافت۔ دلیل وقانون کی حکمرانی
مولانا زاہد الراشدی

دعوتِ فکر ــــــــــ 54
اپریل فول — حافظ محمد زاہد

اقبالیات ــــــــــ 65
کلامِ اقبال: قرآن کے ترازو میں (۳)
پروفیسر عبداللہ شاہین

تحریکِ تجدّد و متجدّدین ــــــــــ 77
مولانا وحید الدین خان: اپنے الفاظ کے آئینے میں (۲)
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

سیرت و سوانح ــــــــــ 89
امام حماد بن سلمہؒ — عبدالرشید عراقی

وَاذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَمِیْثَاقَہُ الَّذِیْ وَاثَقَکُمْ بِہٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جلد :	61
شمارہ :	4
جُمادیٰ الاُولیٰ	1433ھ
اپریل	2012ء
فی شمارہ	25/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	250 روپے
بھارت وبنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700' فون: 3-35869501
فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو' لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36271241

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

عرضِ احوال

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

”خادمِ اعلیٰ“ پنجاب شہباز شریف بن میاں شریف کے نام

اللہ تعالیٰ سورۂ آل عمران میں فرماتا ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾﴾

”اور سب مل کر اللہ کی رسّی (قرآن) کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا‘ اور اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اُس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے‘ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ تمہیں اپنی آیتیں کھول کھول کر سناتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔“

مفسّرینِ قرآن کی اکثریت نے قرآن پاک کو حبل اللہ قرار دیا ہے‘ یعنی یہ وہ رسّی ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے لٹکائی گئی ہے۔ انسان اگر اس رسی کے سرے کو تھام لے تو تعلق مع اللہ قائم ہو جائے گا اور جتنی مضبوطی سے مسلمان قرآن پاک کو تھامے گا اتنا ہی مضبوط اس کا تعلق اسے نازل کرنے والی ہستی سے قائم ہو جائے گا۔ بعض مفسّرین نے دینِ متین کو حبل اللہ قرار دیا ہے‘ لیکن اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا‘ اس لیے کہ دین اسلام سے مراد بھی قرآن پاک اور اس کی وہ تفاسیر اور تشریحات ہیں جو مفسّرِ اعظم یعنی نبی اکرم ﷺ نے اپنے مبارک اقوال وافعال سے کیں‘ جن کے لیے حدیث اور سُنّت کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ گویا اگر ہم حبل اللہ سے مراد دین بھی لیں تب بھی قرآن پاک ہی کو مرکزی اور کلیدی حیثیت حاصل ہوگی۔ نبی اکرم ﷺ روزِ قیامت اللہ ربّ العزّت کے دربار میں اپنی اُمّت سے شکوہ کا اظہار کچھ یوں کریں گے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾﴾ (الفرقان)

”اور رسول کہیں گے کہ اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔“

حاصل گفتگو یہ ہے کہ جس نے اللہ کے کلام سے اپنے تعلق کو کمزور کیا شفیق وکریم نبی ﷺ سے اس کا تعلق مضبوط رہ ہی نہیں سکتا۔ ایسی صورت میں یہ تعلق مصنوعی اور خود فریبی پر مبنی ہوگا۔ مسلمانوں کے لیے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت اُس کا اصل اثاثہ اور سرمایہ ہے۔ جو مسلمان اس دولت سے محروم ہوا وہ دنیا میں بطورِ مسلمان رجسٹر تو ہوگا‘ قانونی طور پر اُن تمام مراعات کا حق دار بھی ہوگا جن کا ایک مسلمان دعوے دار ہوتا ہے‘ لیکن حقیقت کیا ہوگی؟ اسے ہم اس لیے زیر بحث نہیں لائیں گے کہ نہ ہی یہ ہمارا موضوع ہے اور نہ ہی ہم اس حوالہ سے مستند اور معتبر ہونے کے دعوے دار ہیں‘ بلکہ اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ جس مبارک کتاب کو اللہ تعالیٰ نے حبل اللہ قرار دیا ہے اس کے ہم پر کیا حقوق ہیں۔

بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا ایک کتابچہ ”مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق“ کے نام سے ہے‘ جس میں انہوں نے مسلمانوں پر قرآن مجید کے پانچ حقوق گنوائے ہیں: (۱) ایمان وتعظیم (۲) تلاوت وترتیل (۳) تذکر وتدبر (۴) حکم اقامت (۵) تبلیغ وتبیین۔ اوّلاً یہ کہ خالق کائنات کے پاک کلام پر ایمان لایا جائے اور دل وجان سے اس کی عزت اور احترام کیا جائے۔ ثانیاً یہ کہ باوضو ہو کر تجوید اور خوش الحانی سے تلاوت کی جائے اور اس میں باقاعدگی اور تسلسل ہو۔ ثالثاً یہ کہ اگرچہ ہمارا ایمان ہے کہ کوئی عجمی بھی جب قرآن کو بلا سمجھے اور مطالب ومفہوم جانے بغیر پڑھے تب بھی وہ ثواب کا حق دار ہے‘ لیکن اتنے ثواب کا حقدار نہیں ہوگا جتنا وہ شخص چاہے وہ عربی ہو یا عجمی جو مطالب ومفاہیم سمجھ اور جان کر پڑھے گا۔ پھر یہ کہ قرآن کتابِ ہدایت ہے‘ اگر قرآن کا کوئی قاری اس پکار اور اس صدا ہی کو سمجھ نہ سکے گا اور ان مطالبات کا شعور ہی نہیں رکھے گا جو قرآن پاک ایک مسلمان سے کر رہا ہے تو اس کا مطلوب انسان کیسے بن سکے گا؟ اور اگر وہ خود قرآن کو سمجھنے سے قاصر ہوگا تو حکم واقامت اور تبلیغ وتبیین یعنی چوتھے اور پانچویں حقوق کی ادائیگی ناممکن نہ سہی انتہائی مشکل اور پُرخطر تو ہوگی۔ حکم و اقامت سے مراد انفرادی اور اجتماعی سطح پر قرآن پر عمل کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے ماننا‘ پڑھنا اور سمجھنا‘ سب کچھ اصلاً عمل ہی کے لیے مطلوب ہے۔ اسی لیے مسلمان معاشروں میں اور برّصغیر میں شروع ہی سے بچوں کو گھروں اور مساجد میں قرآن پڑھایا جاتا تھا‘ پھر باقاعدہ

(باقی صفحہ 94 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الاَنفَال

آیات ۲۰ تا ۲۸

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَلَا
تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ
الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ
اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ
اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَیْهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ
اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ
تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَیَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ
الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ
وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ
وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۸﴾

آیت ۲۰ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾﴾ ’’اے اہلِ ایمان! اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جبکہ تم سن رہے ہو۔‘‘

یعنی جب اللہ کے رسول ﷺ نے بدر کی طرف چلنے کا ارادہ کر لیا تو پھر تمہاری طرف سے

ردّ و قدح اور بحث و استدلال کیوں ہو رہا تھا؟ تم سب کو تو چاہیے تھا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی پر فوراً سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہتے اور آپؐ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کر دیتے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ یہاں خاص طور پر ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اس موقع پر کمزوری دکھائی تھی۔

آیت ۲۱ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ’’اور ان لوگوں کی مانند مت ہو جاؤ جو کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور حقیقت میں وہ سنتے نہیں ہیں۔‘‘

یعنی صرف زبان سے سَمِعْنَا کہہ دیتے ہیں مگر اُن کے دل اپنے خیالات اور مفادات پر ہی ڈیرے جمائے رہتے ہیں۔ اطاعت پر ان کی طبیعت میں یکسوئی پیدا ہی نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس طرح کے سننے کی سرے سے کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

آیت ۲۲ ﴿اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ’’یقیناً تمام چوپایوں میں اللہ کے نزدیک بدترین وہ بہرے گونگے (انسان) ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔‘‘

یہاں پر واضح طور پر منافقین کو بدترین جانور قرار دیا گیا ہے۔

آیت ۲۳ ﴿وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ﴾ ’’اور اگر اللہ کے علم میں ہوتا کہ ان میں کوئی خیر ہے تو وہ انہیں سنوا دیتا۔‘‘

﴿وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾ ’’اور اگر وہ انہیں (بھلائی کے بغیر) سنوا بھی دیتا تو وہ اعراض کرتے ہوئے پیٹھ پھیر جاتے۔‘‘

اگر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے اندر کوئی صلاحیت پاتا تو ان کو سننے اور سمجھنے کی توفیق دے دیتا‘ لیکن اگر انہیں بغیر صلاحیت کے تعمیلِ حکم میں جنگ کے لیے نکل آنے کی توفیق دے بھی دی جاتی تو یہ خطرے کا موقع دیکھتے ہی پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ یہ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے تنبیہہ ہے جو کفار کے لشکر کا سامنا کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے۔

آیت ۲۴ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ۚ﴾ ’’اے اہلِ ایمان! لبیک کہا کرو اللہ اور رسول (ﷺ) کی پکار پر جب وہ تمہیں پکاریں اُس شے کے لیے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے۔‘‘

تم جنگ کے لیے جاتے ہوئے سمجھ رہے ہو کہ یہ موت کا گھاٹ ہے‘ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ تو اصل اور ابدی زندگی کا دروازہ ہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں شہداء کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴾۔ چنانچہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ جس چیز کی طرف تمہیں بلا رہے ہیں‘ حقیقی زندگی وہی ہے۔ اس کے مقابلے میں اس دعوت سے اعراض کر کے زندگی بسر کرنا گویا حیوانوں کی سی زندگی ہے‘ جس کے بارے میں ہم سورۃ الاعراف میں پڑھ چکے ہیں: ﴿اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ﴾ (الاعراف:۱۷۹)۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ﴾ ’’اور جان رکھو کہ اللہ بندے اور اُس کے دل کے درمیان حائل ہو جایا کرتا ہے‘‘

یعنی اگر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی پکار سُنی اَن سُنی کر دی جائے اور اُن کے احکامات سے بے نیازی کو وطیرہ بنا لیا جائے تو اللہ تعالیٰ خود ایسے بندے اور ہدایت کے درمیان آڑ بن جاتا ہے‘ جس سے آئندہ وہ ہدایت کی ہر بات سننے اور سمجھنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ اسی مضمون کو سورۃ البقرۃ کی آیت ۷ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ ۭ﴾ کہ ان کے دلوں اور ان کی سماعت پر اللہ نے مہر کر دی ہے۔ جبکہ سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۰ میں اس اصول کو سخت ترین الفاظ میں اس طرح واضح کیا گیا ہے: ﴿وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ یعنی حق کے پوری طرح واضح ہو کر سامنے آ جانے پر بھی جو لوگ فوری طور پر اسے مانتے نہیں اور اس سے پہلوتہی کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کے دل الٹ دیے جاتے ہیں اور ان کی بصارت پلٹ دی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ بہت حساس اور خوف کھانے والا معاملہ ہے۔ دین کا کوئی مطالبہ کسی کے سامنے آئے‘ اللہ کا کوئی حکم اس تک پہنچ جائے اور اس کا دل اس پر گواہی بھی دے دے کہ ہاں یہ بات درست ہے‘ پھر اگر وہ اس سے اعراض کرے گا‘ کنّی کترائے گا‘ تو اس کی سزا اسے اس دنیا میں یوں بھی مل سکتی ہے کہ حق کو پہچاننے کی صلاحیت ہی اس سے سلب کر لی جاتی ہے‘ دل اور سماعت پر مہر لگ جاتی ہے‘ آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں‘ ہدایت اور اس کے درمیان آڑ کر دی جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت اور اس کا اٹل قانون ہے۔

﴿وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴾ ’’اور یہ کہ (بالآخر) تم سب کو یقیناً اُسی کی طرف جمع کیا جانا ہے۔‘‘

آیت ۲۵ ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً ۚ﴾ ’’اور ڈرو اُس فتنے سے جو تم میں سے صرف گنہگاروں ہی کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا۔‘‘

یہ بھی قانونِ خداوندی ہے اور اس سے پہلے بھی اس قانون کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ کسی جرم کا براہِ راست ارتکاب کرنا ہی صرف جرم نہیں ہے‘ بلکہ کسی فرض کی عدم ادائیگی کا فعل بھی جرم کے زمرے میں آتا ہے۔ مثلاً ایک مسلمان ذاتی طور پر گناہوں سے بچ کر بھی رہتا ہے اور نیکی کے کاموں میں بھی حتی الوسع حصہ لیتا ہے۔ وہ صدقہ و خیرات بھی دیتا ہے اور نماز‘ روزہ کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ یہ سب کچھ تو وہ کرتا ہے مگر دوسری طرف اللہ اور اس کے دین کی نصرت‘ اقامتِ دین کی جدّوجُہد اور اس جدّوجہد میں اپنے مال اور اپنے وقت کی قربانی جیسے فرائض سے پہلوتہی کا رویّہ اپنائے ہوئے ہے تو ایسا شخص بھی گویا مجرم ہے اور عذاب کی صورت میں وہ اس کی لپیٹ سے بچ نہیں پائے گا۔ اس لحاظ سے یہ دل دہلا دینے والی آیت ہے۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ ’’اور جان لو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔‘‘

اب اگلی آیت کو خصوصی طور پر پاکستان کے مسلمانوں کے حوالے سے پڑھیں۔

آیت ۲۶ ﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ ’’اور یاد کرو جبکہ تم تھوڑی تعداد میں تھے اور زمین میں دبا لیے گئے تھے‘‘

﴿تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ﴾ ’’تمہیں اندیشہ تھا کہ لوگ تمہیں اُچک لے جائیں گے‘‘

یہ آیت خاص طور پر مسلمانانِ پاکستان پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ برصغیر میں مسلمان اقلیت میں تھے‘ ہندوؤں کی اکثریت کے مقابلے میں انہیں خوف تھا کہ وہ اپنے حقوق کا تحفّظ کرنے میں کمزور ہیں۔ اپنے جان و مال کو درپیش خطرات کے علاوہ انہیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ اکثریت کے ہاتھوں ان کا معاشی‘ سماجی‘ سیاسی‘ لسانی‘ مذہبی وغیرہ ہر اعتبار سے استحصال ہوگا۔

﴿فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾

’’تو اللہ نے تمہیں پناہ کی جگہ دے دی اور تمہاری مدد کی اپنی خاص نصرت سے اور تمہیں بہترین پاکیزہ رزق عطا کیا‘ تاکہ تم شکر ادا کرو۔‘‘

آیت ۲۷ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ﴾ ''اے اہلِ ایمان! مت خیانت کرو اللہ سے اور رسول (ﷺ) سے''

اللہ کی امانت میں خیانت یقیناً بہت بڑی خیانت ہے۔ ہمارے پاس اللہ کی سب سے بڑی امانت اس کی وہ روح ہے جو اس نے ہمارے جسموں میں پھونک رکھی ہے۔ اسی کے بارے میں سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾﴾ ''ہم نے (اپنی) امانت کو آسمانوں' زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ اس سے ڈر گئے' مگر انسان نے اسے اٹھا لیا' یقیناً وہ ظالم اور جاہل تھا''۔ پھر اس کے بعد دین' قرآن اور شریعت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بڑی بڑی امانتیں ہیں جو ہمیں سونپی گئی ہیں۔ چنانچہ ایمان کا دم بھرنا' اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کا دعویٰ کرنا' لیکن پھر اللہ کے دین کو مغلوب دیکھ کر بھی اپنے کاروبار' اپنی جائیداد' اپنی ملازمت اور اپنے کیریئر کی فکر میں لگے رہنا' اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ اس سے بڑی بے وفائی' غداری اور خیانت اور کیا ہوگی!

﴿وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾﴾ ''اور نہ ہی اپنی (آپس کی) امانتوں میں خیانت کرو جانتے بوجھتے۔''

آیت ۲۸ ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ ''اور جان لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں''

فتنہ کے معنی آزمائش اور اس کسوٹی کے ہیں جس پر کسی کو پرکھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے مال اور اولاد انسان کے لیے بہت بڑی آزمائشیں ہیں۔ یقیناً مال اور اولاد ہی انسان کے پاؤں کی سب سے بڑی بیڑیاں ہیں جو اُسے نصرتِ دین کی جدوجہد سے روک کر اس کی عاقبت خراب کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی شعوری اور فعال زندگی کے شب و روز مال کمانے' اُسے سینت سینت کر رکھنے اور اولاد کے مستقبل کو محفوظ بنانے میں اس انداز سے کھپا دیتا ہے کہ اس میں اور کولہو کے بیل میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اس کے بعد اس کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی بچتی ہی نہیں جسے وہ دین کی جدّوجُہد کے لیے پیش کر کے اپنے اللہ کے حضور سرخرو ہو سکے۔

﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۸﴾﴾ ''اور یہ کہ اللہ ہی کے پاس ہے بڑا اجر۔''

آیات ۲۹ تا ۴۰

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّیُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۹﴾ وَاِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ ؕ وَیَمْكُرُوْنَ وَیَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ﴿۳۰﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۳۲﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَمَا لَهُمْ اَلَّا یُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ یَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِیَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِیَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِیَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَیُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَیْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ یُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لِیَمِیْزَ اللّٰهُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ وَیَجْعَلَ الْخَبِیْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَیَرْكُمَهٗ جَمِیْعًا فَیَجْعَلَهٗ فِیْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۸﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۴۰﴾

آیت ۲۹ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ ''اے اہلِ ایمان! اگر تم اللہ کے تقویٰ پر برقرار رہو گے تو وہ تمہارے لیے فرقان پیدا کر دے گا''

اگر تم تقویٰ کی روش اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یکے بعد دیگرے تمہارے لیے فرقان آتا رہے گا۔ جیسے پہلا فرقان غزوۂ بدر میں تمہاری فتح کی صورت میں آ گیا۔

﴿وَّیُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۹﴾﴾ ''اور دور کر دے گا تم سے تمہاری برائیاں (کمزوریاں) اور تمہیں بخش دے گا۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

آیت ۳۰ ﴿وَاِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ ''اور یاد کیجیے جب کفار آپؐ کے خلاف سازشیں کر رہے تھے''

﴿لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ ؕ﴾ ''کہ آپؐ کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا (مکّہ سے) نکال دیں۔''

یہ ان سازشوں کا ذکر ہے جو قریشِ مکّہ ہجرت سے پہلے کے زمانے میں رسول اللہ ﷺ کے خلاف کر رہے تھے۔ آپ ﷺ کی مخالفت میں اُن کے باقی تمام حربے ناکام ہو گئے تو وہ (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کے قتل کے درپے ہو گئے اور اس بارے میں سنجیدگی سے صلاح مشورے کرنے لگے۔

﴿وَیَمْكُرُوْنَ وَیَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ﴿۳۰﴾﴾ ''وہ بھی چالیں چل رہے تھے اور اللہ بھی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ اللہ بہترین منصوبہ بندی کرنے والا ہے۔''

آیت ۳۱ ﴿وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۱﴾﴾ ''اور جب انہیں ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں بہت سن لیا ہم نے (یہ کلام)' اگر ہم چاہیں تو ایسا کلام ہم بھی کہہ دیں' یہ کچھ نہیں سوائے پچھلے لوگوں کی کہانیوں کے۔''

تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں یہ قول نضر بن حارث سے منسوب ہے۔ لیکن ان کی اس طرح کی باتیں صرف کہنے کی حد تک تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کو بار بار یہ چیلنج دیا گیا کہ اگر تم لوگ اس قرآن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ نہیں سمجھتے تو تم بھی اسی طرح کا

کلام بنا کر لے آؤ اور کسی ثالث سے فیصلہ کرا لو' مگر وہ لوگ اس چیلنج کو قبول کرنے کی کبھی جرأت نہ کر سکے۔ اسی طرح پچھلی صدی تک عام مستشرقین بھی یہ الزام لگاتے رہے ہیں کہ محمد (ﷺ) نے تورات اور انجیل سے معلومات لے کر قرآن بنایا ہے' مگر آج کل چونکہ تحقیق کا دور ہے' اس لیے اُن کے ایسے بے تکے الزامات خود بخود ہی کم ہو گئے ہیں۔

آیت ۳۲ ﴿وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۳۲﴾﴾ ''اور جب انہوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری ہی طرف سے برحق ہے تو برسا دے ہم پر پتھر آسمان سے یا بھیج دے ہم پر کوئی دردناک عذاب۔''

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ سردارانِ قریش کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ مکہ کے عام لوگوں کو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے اثرات سے کیسے محفوظ رکھا جائے۔ اس کے لیے وہ مختلف قسم کی تدبیریں کرتے رہتے تھے' جن کا ذکر قرآن میں بھی متعدد بار ہوا ہے۔ اس آیت میں ان کی ایسی ہی ایک تدبیر کا تذکرہ ہے۔ اُن کے بڑے بڑے سردار عوام کے اجتماعات میں علی الاعلان اس طرح کی باتیں کرتے تھے کہ اگر یہ قرآن اللہ ہی کی طرف سے نازل کردہ ہے اور ہم اس کا انکار کر رہے ہیں تو ہم پر اللہ کی طرف سے عذاب کیوں نہیں آ جاتا؟ بلکہ وہ اللہ کو مخاطب کر کے دعائیہ انداز میں بھی پکارتے تھے کہ اے اللہ! اگر یہ قرآن تیرا ہی کلام ہے تو پھر اس کا انکار کرنے کے سبب ہمارے اوپر آسمان سے پتھر برسا دے' یا کسی بھی شکل میں ہم پر اپنا عذاب نازل فرما دے۔ اور اس کے بعد وہ اپنی اس تدبیر کی خوب تشہیر کرتے کہ دیکھا ہماری اس دعا کا کچھ بھی ردِّعمل نہیں ہوا' اگر یہ واقعی اللہ کا کلام ہوتا تو ہم پر اب تک عذاب آ چکا ہوتا۔ چنانچہ اس طرح وہ اپنے عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

آیت ۳۳ ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ ۚ﴾ ''اور اللہ ایسا نہ تھا کہ اُن کو عذاب دیتا جبکہ (ابھی) آپؐ اُن کے درمیان موجود تھے۔''

اگرچہ وہ لوگ عذاب کے پوری طرح مستحق ہو چکے تھے' لیکن جس طرح کے عذاب کے لیے وہ لوگ دعائیں کر رہے تھے ویسا عذاب سنتِ الٰہی کے مطابق اُن پر اُس وقت تک نہیں آ سکتا تھا جب تک اللہ کے رسول ﷺ مکہ میں ان کے درمیان موجود تھے' کیونکہ ایسے عذاب کے نزول سے پہلے اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ اور اہلِ ایمان کو ہجرت کا حکم دے دیتا ہے اور ان کے

نکل جانے کے بعد ہی کسی آبادی پر اجتماعی عذاب آیا کرتا ہے۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿٣٣﴾﴾ ''اور اللہ ان کو عذاب دینے والا نہیں تھا جب کہ وہ استغفار بھی کر رہے تھے۔''

اس لحاظ سے مکہ کی آبادی کا معاملہ بہت گڈ مڈ تھا۔ مکہ میں عوام الناس بھی تھے' سادہ لوح لوگ بھی تھے جو اپنے طور پر اللہ کا ذکر کرتے تھے' تلبیہ پڑھتے تھے اور اللہ سے استغفار بھی کرتے تھے۔ دوسری طرف اللہ کا قانون ہے جس کا ذکر اسی سورت کی آیت ۳۷ میں ہوا ہے کہ جب تک وہ پاک اور ناپاک کو چھانٹ کر الگ نہیں کر دیتا ﴿لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ اس وقت تک اس نوعیت کا عذاب کسی قوم پر نہیں آتا۔

آیت ۳۴ ﴿وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ ''اور کیا (رکاوٹ) ہے ان کے لیے کہ اللہ اُن کو عذاب نہ دے جب کہ وہ روک رہے ہیں مسجدِ حرام سے (لوگوں کو)''

﴿وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَاۗؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٤﴾﴾ ''درآنحالیکہ وہ اس کے متولی بھی نہیں ہیں۔ اس کے (اصل) متولی تو صرف متقی لوگ ہیں' لیکن ان کی اکثریت علم نہیں رکھتی۔''

آیت ۳۵ ﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاۗءً وَّتَصْدِيَةً ۭ﴾ ''اور نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس سوائے سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا۔''

قریشِ مکہ نے اپنی عبادات کا حلیہ اس طرح بگاڑا تھا کہ اپنی نماز میں سیٹیوں اور تالیوں جیسی خرافات بھی شامل کر رکھی تھیں۔ اسی طرح خانہ کعبہ کا سب سے اعلیٰ طواف اُن کے نزدیک وہ تھا جو بالکل برہنہ ہو کر کیا جاتا۔

﴿فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿٣٥﴾﴾ ''تو اب چکھو مزہ عذاب کا اپنے کفر کی پاداش میں۔''

یہاں واضح کر دیا گیا کہ اللہ کا عذاب صرف آسمان سے پتھروں کی صورت ہی میں نہیں آیا کرتا بلکہ غزوۂ بدر میں ان کی فیصلہ کن شکست ان کے حق میں اللہ کا عذاب ہے۔

آیت ۳۶ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''یقیناً

کافر لوگ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں تاکہ (لوگوں کو) روکیں اللہ کے رستے سے۔''

قریش کی طرف سے لشکر کی تیاری' ساز و سامان کی فراہمی' اسلحہ کی خریداری' اونٹوں' گھوڑوں اور راشن وغیرہ کا بندوبست بھی اس قسم کے انفاق فی سبیل الشیطان اور فی سبیل الشرک کی مثال ہے۔ وہ لوگ گویا شیطان کے راستے کے مجاہدین تھے اور اللہ کی مخلوق کو اس کے راستے سے روکنا اُن کا مشن تھا۔

﴿فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۭ﴾ ''تو وہ (اور بھی) خرچ کریں گے' پھر یہ ان کے لیے ایک حسرت بن جائے گا' پھر یہ مغلوب ہو کر رہیں گے۔''

یہ خرچ کرنا ان کے لیے موجبِ حسرت ہوگا اور یہ پچھتاوا ان کی جانوں کا روگ بن جائے گا کہ اپنا مال بھی کھپا دیا' جانیں بھی ضائع کر دیں' لیکن اس پوری کوشش کے باوجود محمد ﷺ کا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔ ان کی یہ حسرتیں اُس وقت اور بھی بڑھ جائیں گی جب ﴿وَقُلْ جَاۗءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿٨١﴾﴾ (بنی اسرائیل) کی تفسیر عملی طور پر اُن کے سامنے آ جائے گی اور وہ مغلوب ہو کر اہلِ حق کے سامنے اُن کے رحم و کرم کی بھیک مانگ رہے ہوں گے۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿٣٦﴾﴾ ''اور جو کفر پر رہیں گے وہ جہنم کی طرف گھیر کر لے جائے جائیں گے۔''

یعنی ان میں سے جو لوگ ایمان لے آئیں گے اللہ تعالیٰ انہیں معاف کر دے گا' اور جو کفر پر اَڑے رہیں گے اور کفر پر ہی ان کی موت آئے گی تو ایسے لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

آیت ۳۷ ﴿لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰي بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ۭ﴾ ''تاکہ اللہ پاک کو ناپاک سے (چھانٹ کر) علیحدہ کر دے اور ناپاک کو ایک دوسرے کے اوپر رکھتے ہوئے سب کو ایک ڈھیر بنا دے' پھر اس کو جہنم میں جھونک دے۔''

﴿اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٣٧﴾﴾ ''یقیناً یہی لوگ ہیں خسارہ پانے والے۔''

آیت ۳۸ ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ﴾ ''(اے محمد ﷺ!) آپ اعلان کر دیجیے ان کافروں کے سامنے کہ اگر وہ اب بھی باز آ جائیں تو جو

کچھ پہلے ہو چکا ہے وہ ان کے لیے معاف کر دیا جائے گا۔''

یعنی اب بھی موقع ہے کہ ایمان لے آؤ تو تمہاری پہلی تمام خطائیں معاف کر دی جائیں گی۔

﴿وَاِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''اور اگر وہ دوبارہ یہی کچھ کریں گے تو پچھلوں کے حق میں سُنّتِ الٰہی گزر چکی ہے۔''

انہیں سب معلوم ہے کہ جن قوموں نے اپنے رسولوں کا انکار کیا تھا اُن کا کیا انجام ہوا تھا۔ سورۃ الانفال سے پہلے مکی قرآن تو پورے کا پورا نازل ہو چکا تھا' سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف بھی نازل ہو چکی تھیں۔ لہٰذا قومِ نوحؑ' قومِ ہودؑ' قومِ صالحؑ' قومِ شعیبؑ اور قومِ لوطؑ کے عبرتناک انجام کی تفصیلات سب کو معلوم ہو چکی تھیں۔

آیت ۳۹ ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ ''اور (اے مسلمانو!) ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (کفر) باقی نہ رہے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کا ہو جائے۔''

یہی حکم سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۳ میں بھی آ چکا ہے۔ البتہ یہاں اس کے الفاظ میں ''کُلُّہٗ'' کی اضافی شان اور مزید تاکید پائی جاتی ہے۔ یعنی اے مسلمانو! تمہاری تحریک کو شروع ہوئے پندرہ برس ہو گئے۔ اس دوران میں دعوت' تنظیم' تربیت اور صبر محض کے مراحل کامیابی سے طے ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اب passive resistance کا دور ختم سمجھو۔ نبی اکرم ﷺ کی طرف سے اقدام (active resistance) کا آغاز ہو چکا ہے اور اس اقدام کے نتیجے میں اب یہ تحریک مسلّح تصادم (armed conflict) کے مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔ لہٰذا جب ایک دفعہ تلواریں تلواروں سے ٹکرا چکی ہیں تو تمہاری یہ تلواریں اب واپس نیاموں میں اُس وقت تک نہیں جائیں گی جب تک یہ کام مکمل نہ ہو جائے اور اس کام کی تکمیل کا تقاضا یہ ہے کہ فتنہ بالکل ختم ہو جائے۔ ''فتنہ'' کسی معاشرے کے اندر باطل کے غلبے کی کیفیت کا نام ہے جس کی وجہ سے اس معاشرے کے لوگوں کے لیے ایمان پر قائم رہنا اور اللہ کے احکامات پر عمل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ جنگ اب اس وقت تک جاری رہے گی جب تک باطل مکمل طور پر مغلوب اور اللہ کا دین پوری طرح سے غالب نہ ہو جائے۔ اللہ کے دین کا یہ غلبہ جزوی طور پر بھی قابل قبول نہیں بلکہ دین کُل کا کُل اللہ کے تابع ہونا چاہیے۔

﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾﴾ ''پھر اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ یقیناً اس کو دیکھ رہا ہے۔''

آیت ۴۰ ﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾﴾ ''اور اگر وہ رُوگردانی کریں تو (اے مسلمانو!) تم یہ جان لو کہ اللہ تمہارا مولیٰ (حمایتی) ہے۔ کیا ہی خوب ہے وہ مولیٰ اور کیا ہی خوب ہے وہ مددگار!''

آیات ۴۱ تا ۴۴

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ۭ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾

آیت ۴۱ ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى﴾ ''اور جان لو کہ جو بھی غنیمت تمہیں حاصل ہوئی ہے اُس کا خمس (پانچواں حصہ) تو اللہ کے لیے' رسولؐ کے لیے اور (رسولؐ کے) قرابت داروں کے لیے ہے''

اس آیت میں مالِ غنیمت کا حکم بیان ہو رہا ہے۔ واضح رہے کہ بعثت کے بعد سے رسول اللہ ﷺ کا ذریعہ معاش کوئی نہیں تھا۔ شادی کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ساری دولت

ہر قسم کے تصرف کے لیے آپ ﷺ کو پیش کر دی تھی۔ جب تک آپ ﷺ مکہ میں رہے' کسی نہ کسی طرح اسی سرمائے سے آپؐ کے ذاتی اخراجات چلتے رہے' لیکن ہجرت کے بعد اس سلسلے میں کوئی مستقل انتظام نہیں تھا۔ پھر آپ ﷺ کے قرابت دار اور اہل وعیال بھی تھے جن کی کفالت آپؐ کے ذمہ تھی۔ ان سب اخراجات کے لیے ضروری تھا کہ کوئی معقول اور مستقل انتظام کر دیا جائے۔ چنانچہ غنائم میں سے پانچواں حصہ مستقل طور پر بیت المال کو دے دیا گیا اور آپؐ کے ذاتی اخراجات' ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا نان نفقہ اور آپؐ کے قرابت داروں کی کفالت بیت المال کے ذمہ طے پائی۔

﴿وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ ''اور (اس میں حصہ ہوگا) یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کے لیے (بھی)''

اسی پانچویں حصے میں سے معاشرے کے محروم افراد کی مدد بھی کی جائے گی۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ﴾ ''اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اُس شے پر جو ہم نے نازل کی اپنے بندے پر فیصلے کے دن' جس دن دو فوجوں کا ٹکراؤ ہوا تھا۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٤١﴾﴾ ''اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔''

فیصلے (غزوۂ بدر) کے دن جو شے خصوصی طور پر نازل کی گئی وہ غیبی امداد اور نصرتِ الٰہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ تمہاری مدد کے لیے فرشتے آئیں گے۔ وہ فرشتے اگرچہ کسی کو نظر تو نہیں آتے تھے' لیکن جیسے تم لوگ بہت سی دوسری چیزوں پر ایمان بالغیب رکھتے ہو' اللہ پر اور اُس کی وحی پر ایمان رکھتے ہو' جبرائیل علیہ السلام کے وحی لانے پر ایمان رکھتے ہو اور اس قرآن کے منزّل من اللہ ہونے پر ایمان رکھتے ہو' اسی طرح تمہارا یہ ایمان بھی ہونا چاہیے کہ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا جو اس نے اپنے رسول ﷺ اور مسلمانوں کی مدد کے سلسلے میں کیا تھا اور یہ کہ تمہاری یہ فتح اللہ کی مدد سے ہی ممکن ہوئی ہے۔ اگر تم لوگوں کا اس حقیقت پر یقین کامل ہے تو پھر اللہ کا یہ فیصلہ بھی دل کی آمادگی اور خوشی سے قبول کر لو کہ مالِ غنیمت میں سے پانچواں حصہ اللہ' اس کے رسولؐ اور بیت المال کا ہوگا۔

اس حکم کے نازل ہونے کے بعد تمام مالِ غنیمت ایک جگہ جمع کیا گیا اور اس میں سے پانچواں حصہ بیت المال کے لیے نکال کر باقی چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر دیے گئے۔ اس میں

سے ہر اُس شخص کو برابر کا حصہ ملا جو لشکر میں جنگ کے لیے شامل تھا' قطع نظر اس کے کہ کسی نے عملی طور پر قتال کیا تھا یا نہیں کیا تھا اور قطع نظر اس کے کہ کسی نے بہت سا مالِ غنیمت جمع کیا تھا یا کسی نے کچھ بھی جمع نہیں کیا تھا۔ البتہ اس تقسیم میں سوار کے دو حصے رکھے گئے اور پیدل کے لیے ایک حصہ۔ اس لیے کہ سواریوں کے جانور مہیّا کرنے اور اُن جانوروں پر اٹھنے والے اخراجات متعلقہ افراد ذاتی طور پر برداشت کرتے تھے۔

آیت ۴۲ ﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى﴾ ''جب تم لوگ تھے قریب والے کنارے پر اور وہ لوگ تھے دُور والے کنارے پر''

وادیٔ بدر دونوں اطراف سے تنگ ہے جب کہ درمیان میں میدان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس وادی کا ایک تنگ کنارہ شمال کی طرف ہے جہاں سے شام کی طرف راستہ نکلتا ہے اور دوسرا کنارہ جنوب کی طرف ہے جہاں سے مکہ کو راستہ جاتا ہے۔ وادی میں سے ایک راستہ مشرق کی سمت بھی نکلتا ہے جو مدینہ کی طرف جاتا ہے۔ لہٰذا پرانے زمانے میں حاجیوں کے زیادہ تر قافلے وادیٔ بدر سے ہی گزرتے تھے۔ اب نئی موٹروے ''طریق الھجرۃ'' بن جانے سے لوگوں کو ان مقامات سے گزرنے کا موقع نہیں ملتا۔ غزوۂ بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی تدبیر کا ظہور ہوا کہ دونوں لشکر وادیٔ بدر میں ایک ساتھ پہنچے۔ یہاں اسی کا ذکر ہے کہ جب قریش کا لشکر وادی کے دور والے (جنوبی) کنارے پر آ پہنچا اور مشرق کی جانب سے حضور ﷺ اپنا لشکر لے کر اس کنارے پر پہنچ گئے جو مدینہ سے قریب تھا۔

﴿وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ ''اور قافلہ تم سے نیچے تھا۔''

قریش کا تجارتی قافلہ اس وقت نیچے ساحل سمندر کی طرف سے ہو کر گزر رہا تھا۔ ابوسفیان نے ایک طرف تو قافلے کی حفاظت کے لیے مکہ والوں کو پیغام بھیج دیا تھا اور دوسری طرف اصل راستے کو چھوڑ دیا تھا جو وادیٔ بدر سے ہو کر گزرتا تھا اور اب یہ قافلہ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ بدر کے پہاڑی سلسلے سے آگے تہامہ کا میدان ہے جو ساحل سمندر تک پھیلا ہوا ہے۔ اور قافلہ اس وقت اس میدان کی بھی آخری حدود پر سمندر کی جانب تھا۔ اس لیے فرمایا گیا کہ قافلہ تم سے نچلی سطح پر تھا۔

﴿وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ﴾ ''اور اگر تم لوگ آپس میں میعاد ٹھہرا کر نکلتے تو بھی وقتِ مقررہ (پر پہنچنے) میں تم ضرور مختلف ہو جاتے''

یعنی یہ تو اللہ کی مشیت کے تحت دونوں لشکر ٹھیک ایک ہی وقت پر وادی کے دونوں کناروں پر پہنچے تھے۔ اگر آپ لوگوں نے مقامِ معیّن پر پہنچنے کے لیے آپس میں کوئی وقت مقرر کیا ہوتا تو اس میں ضرور تقدیم و تاخیر ہو جاتی‘ لیکن ہم نے دونوں لشکروں کو عین وقت پر ایک ساتھ آمنے سامنے لا کھڑا کیا‘ کیونکہ ہم چاہتے تھے کہ یہ ٹکراؤ ہو جائے اور اہلِ مکہ پر یہ بات واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کس کے ساتھ ہے۔

﴿وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ﴾ ’’لیکن (یہ سب کچھ اس لیے ہوا) تاکہ اللہ فیصلہ کر دے اس کام کا جو ہونے ہی والا تھا‘‘

﴿لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ﴾ ’’تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ ہلاک ہو بات واضح ہو جانے کے بعد‘‘

یعنی حق کے واضح ہو جانے میں کوئی ابہام نہ رہ جائے۔ اہل مکہ میں سے اُن عوام کے لیے بھی حق کو پہچاننے میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے جنہیں اب تک سرداروں نے گمراہ کر رکھا تھا۔ اگر اب بھی کسی کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور وہ ہلاکت کے راستے پر ہی گامزن رہنے کو ترجیح دیتا ہے تو یہ اس کی مرضی‘ مگر ہم چاہتے ہیں کہ اگر ایسے لوگوں کو ہلاک ہی ہونا ہے تو ان میں سے ہر فرد حق کے پوری طرح واضح ہونے کے بعد ہلاک ہو۔

﴿وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۴۲﴾ ’’اور جسے زندہ رہنا ہے وہ زندہ رہے واضح دلیل کی بنا پر۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔‘‘

جو سیدھے راستے پر آنا چاہتا ہے وہ بھی اس بَیِّنَہ کی بنا پر سیدھے راستے پر آ جائے اور حیاتِ معنوی حاصل کر لے۔

آیت ۴۳ ﴿اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ﴾ ’’جب اللہ آپ کو دکھا رہا تھا (اے نبی ﷺ) انہیں آپ کی نیند میں کم تعداد میں‘‘

رسول اللہ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ قریش کے لشکر کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے‘ بس تھوڑے سے لوگ ہیں جو بدر کی طرف جنگ کے لیے آ رہے ہیں‘ حالانکہ وہ ایک ہزار افراد پر مشتمل بہت بڑا لشکر تھا۔

﴿وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا﴾ ’’اور اگر آپؐ کو دکھاتا کہ وہ کثیر تعداد میں ہیں‘‘

اور آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو وہ خبر جوں کی توں بتائی ہوتی:

﴿لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ ’’(تو اے مسلمانو!) تم ضرور کمزوری دکھاتے اور معاملے میں اختلاف کرتے‘‘

دشمن کی اصل تعداد اور طاقت کے بارے میں جان کر آپ لوگ پست ہمت ہو جاتے اور اختلاف میں پڑ جاتے کہ ہمیں بدر میں جا کر اس لشکر کا مقابلہ کرنا بھی چاہیے یا نہیں۔ اس طرح آراء میں اختلاف کی بنا پر بھی تمہاری جمعیت میں کمزوری آ جاتی۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۴۳﴾ ’’لیکن اللہ نے سلامتی پیدا فرما دی۔ یقیناً وہ واقف ہے اس سے جو کچھ سینوں کے اندر ہے۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے جو خواب دیکھا وہ تو غلط نہیں ہو سکتا تھا‘ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے تمام خواب سچے ہوتے ہیں۔ اس لیے مفسّرین نے اس نکتے کی توجیہہ اس طرح کی ہے کہ آپ ﷺ کو لشکرِ کفار کی معنوی حقیقت دکھائی گئی تھی۔ یعنی کسی چیز کی ایک کمیت (quantitative value) ہوتی ہے اور ایک اس کی کیفیت اور اس کی اصل حقیقت ہوتی ہے۔ کمیت کے پہلو سے دیکھا جائے تو لشکرِ کفار کی تعداد ایک ہزار تھی اور وہ مسلمانوں سے تین گنا تھے‘ مگر اس لشکر کی اندرونی کیفیت یکسر مختلف تھی۔ درحقیقت مکہ کے عوام الناس کی اکثریت حضور ﷺ کو اپنے معاشرے کا بہترین انسان سمجھتی تھی۔ ان کی سوچ کے مطابق آپؐ کے تمام ساتھی بھی مکہ کے بہترین لوگ تھے۔ مکہ کا عام آدمی دل سے اس حقیقت کو تسلیم کرتا تھا کہ محمد ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے‘ بلکہ یہ لوگ ایک خدا کو ماننے والے‘ نیکیوں کا حکم دینے والے اور شریف لوگ ہیں۔ چنانچہ مکہ کی خاموش اکثریت کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ تھیں۔ ایسے تمام لوگ اپنے سرداروں اور لیڈروں کے حکم کی تعمیل میں لشکر میں شامل تو ہو گئے تھے‘ مگر اُن کے دل اپنے لیڈروں کے ساتھ نہیں تھے۔ جنگ میں دراصل جان کی بازی لگانے کا جذبہ ہی انسان کو بہادر اور طاقتور بناتا ہے اور یہ جذبہ نظریے کی سچائی اور نظریاتی پختگی سے پیدا ہوتا ہے۔ قریش کے اس لشکر میں کسی ایسے حقیقی جذبے کا سرے سے فقدان تھا۔ لہٰذا تعداد میں اگرچہ وہ لوگ زیادہ تھے مگر معنوی طور پر اُن کی جو کیفیت اور اصل حقیقت تھی اس لحاظ سے وہ بہت کم تھے اور حضور ﷺ کو خواب میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی اصل حقیقت دکھائی تھی۔

آیت ۴۴ ﴿وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ﴾

’’اور جب تم آمنے سامنے ہوئے تو تمہاری نظروں میں انہیں (کفار کو) تھوڑا کر کے دکھاتا تھا اور ان کی نظروں میں تمہیں تھوڑا کر کے دکھاتا تھا‘‘

جب دونوں لشکر مقابلے کے لیے آمنے سامنے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ایسی کیفیت پیدا کر دی کہ مسلمانوں کو بھی دیکھنے میں کفار تھوڑے لگ رہے تھے اور کفار کو بھی مسلمان تھوڑے نظر آ رہے تھے۔ ایسی صورتِ حال اللہ تعالیٰ نے اس لیے پیدا فرما دی تاکہ یہ جنگ ڈٹ کر ہو۔ اس لیے کہ وہ اس دن کو ’’یوم الفرقان‘‘ بنانا چاہتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کوئی فریق بھی میدان سے کنّی کترائے۔

﴿لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾﴾ ’’تاکہ اللہ پورا کر دے اُس معاملے کو جو ہونے والا ہی تھا۔ اور تمام معاملات (بالآخر تو) اللہ ہی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔‘‘

آیات ۴۵ تا ۴۸

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّىْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَاۗءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰي عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّنْكُمْ اِنِّىْٓ اَرٰي مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾

آیت ۴۵ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا﴾ ’’اے اہلِ ایمان! جب بھی تمہارا مقابلہ ہو کسی گروہ سے تو ثابت قدم رہو‘‘

یہ وہ دور تھا جب حق و باطل میں مسلّح تصادم شروع ہو چکا تھا اور دین کے غلبے کی جدّوجہد آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ غزوۂ بدر اس سلسلے کی پہلی جنگ تھی اور ابھی بہت سی مزید

جنگیں لڑی جانی تھیں۔ اس پس منظر میں مسلمانوں کو میدانِ جنگ اور جنگی حکمتِ عملی کے بارے میں ضروری ہدایات دی جا رہی ہیں کہ جب بھی کسی فوج سے میدانِ جنگ میں تمہارا مقابلہ ہو تو تم ثابت قدم رہو‘ اور کبھی بھی‘ کسی بھی حالت میں دشمن کو پیٹھ نہ دکھاؤ۔

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ’’اور اللہ کا ذکر کرتے رہو کثرت کے ساتھ تاکہ تم فلاح پاؤ۔‘‘

حالتِ جنگ میں بھی اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو‘ کیونکہ تمہاری اصل طاقت کا انحصار اللہ کی مدد پر ہے۔ لہٰذا تم اللہ پر بھروسہ رکھو: ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ (النحل: ۱۲۷)‘ کیونکہ ایک بندۂ مؤمن کا صبر اللہ کے بھروسے پر ہی ہوتا ہے۔ اگر تمہارے دل اللہ کی یاد سے منور ہوں گے‘ اس کے ساتھ قلبی اور روحانی تعلق استوار ہوگا‘ تو تمہیں ثابت قدم رہنے کے لیے سہارا ملے گا‘ اور اگر اللہ کے ساتھ تمہارا یہ تعلق کمزور پڑ گیا تو پھر تمہاری ہمت بھی جواب دے دے گی۔

آیت ۴۶ ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ’’اور حکم مانو اللہ کا اور اُس کے رسول (ﷺ) کا‘‘

یہ تیسرا حکم ڈسپلن کے بارے میں ہے کہ جو حکم تمہیں رسول ﷺ کی طرف سے ملے اس کی دل و جان سے پابندی کرو۔ اگرچہ یہاں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کی بات ہوئی ہے لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو عملی طور پر یہ اطاعت رسول اللہ ﷺ ہی کی تھی‘ کیونکہ جو حکم بھی آتا تھا وہ آپ ﷺ ہی کی طرف سے آتا تھا۔ قرآن بھی حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوتا تھا اور اگر آپؐ اپنی کسی تدبیر سے اجتہاد کے تحت کوئی فیصلہ فرماتے یا کوئی رائے ظاہر فرماتے تو وہ بھی آپ ﷺ ہی کی زبانِ مبارک سے ادا ہوتا تھا۔ لہٰذا عملاً اللہ کی اطاعت آپ ﷺ ہی کی اطاعت میں مضمر ہے۔ اقبالؔ نے اس نکتے کو بہت خوبصورتی سے اس ایک مصرعے میں سمو دیا ہے: ع ’’بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!‘‘

﴿وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ’’اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی‘ اور ثابت قدم رہو۔ یقیناً اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔‘‘

یہ وہی الفاظ ہیں جو ہم سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۵۲ میں پڑھ چکے ہیں۔ وہاں غزوۂ احد کے واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ

تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ اللہ تعالیٰ کو تو علم تھا کہ ایک سال بعد (غزوۂ اُحد میں) کیا صورتِ حال پیش آنے والی ہے۔ چنانچہ ایک سال پہلے ہی مسلمانوں کو جنگی حکمت عملی کے بارے میں بہت واضح ہدایات دی جارہی ہیں' کہ ڈسپلن کی پابندی کرو اور اطاعت رسول ﷺ پر کاربند رہو۔

آیت ۴۷ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ﴾ ''اور ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جو نکلے تھے اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے' لوگوں کو دکھانے کے لیے''

یہ قریش کے لشکر کی طرف اشارہ ہے۔ جب یہ لشکر مکہ سے روانہ ہوا تو اُس کی شان و شوکت واقعی مرعوب کن تھی۔ اس کے ساتھ عیش وطرب کا سامان بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابوجہل اور دیگر سردارانِ قریش اپنے غرور اور تکبر کے باعث اس زعم میں تھے کہ مٹھی بھر مسلمان ہمارے اس طاقتور لشکر کے سامنے خس وخاشاک ثابت ہوں گے اور اہم انہیں کچل کر رکھ دیں گے۔

﴿وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۴۷﴾ ''اور وہ اللہ کے راستے سے روک رہے تھے۔ اور جو کچھ وہ لوگ کر رہے تھے اللہ اس کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔''

وہ اپنی ساری کوششیں اور توانائیاں مخلوقِ خدا کو اللہ کے راستے سے روکنے کے لیے صَرف کر رہے تھے' مگر اُن کی کوئی تدبیر اللہ کے قابو سے باہر جانے والی تو نہیں تھی۔

آیت ۴۸ ﴿وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ﴾ ''اور جب شیطان نے اُن کے لیے اُن کے اعمال کو مزیّن کر دیا تھا اور اُس نے (ان سے) کہا تھا کہ آج تم پر انسانوں میں سے کوئی غالب نہیں آسکتا''

یعنی ان کے دلوں میں شیطان نے متکبرانہ خیالات پیدا کر دیے تھے اور انہیں خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ تمہارا یہ ساز وسامان' یہ اسلحہ' یہ اتنا بڑا لشکر' یہ سب کچھ غیر معمولی اور انہونی صورتِ حال ہے۔ عرب کی تاریخ میں اس طرح کے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ کس میں ہمت ہے کہ آج اس لشکر کے سامنے ٹھہر سکے اور کس کے پاس اتنی طاقت ہے کہ آج تمہارے اوپر غلبہ پا سکے؟

﴿وَاِنِّىْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ﴾ ''اور میں بھی تمہارے ساتھ ہی ہوں۔''

﴿فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ ''پھر جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو وہ اپنی ایڑیوں کے بل پیچھے پھر گیا''

﴿وَقَالَ اِنِّىْ بَرِىْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّىْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ﴾ ''اور کہنے لگا کہ میں تم سے لاتعلق ہوں' میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو''

چونکہ ابلیس (عزازیل) کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے' لہٰذا ناری مخلوق ہونے کی وجہ سے اُس نے فرشتوں کو نازل ہوتے دیکھ لیا اور یہ کہتے ہوئے اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا کہ میں تو یہاں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم لوگوں کو نظر نہیں آرہا ہے۔

﴿اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۴۸﴾ ''مجھے اللہ کا خوف ہے۔ اور اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

❁❁❁

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 45 روپے اشاعت عام: 25 روپے

خوف وخشیّت

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا لازمی تقاضا

عتیق الرحمٰن صدیقی

خوف کا لغوی مفہوم

جذبہ کیا ہے؟ نفسیاتی زاویہ نگاہ سے کسی احساس کی شدت‘ حدّت اور تلاطم کا نام جذبہ ہے۔ محبت‘ نفرت‘ پیار اور غصہ کی طرح خوف بھی ایک جذبہ ہے‘ جو اگر اعتدال اور توازن میں رہے تو ایک مثبت سوچ اور عمل پر منتج ہوتا ہے۔ عدم توازن کی صورت میں یہ منفی اثرات کا حامل ہوتا ہے اور انسانی شخصیت میں نکھار کے بجائے ٹوٹ پھوٹ کا باعث بنتا ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے‘ لغوی اعتبار سے اس کے معنی ہیں: ’’قرائن وشواہد سے کسی آنے والے خطرے کا اندیشہ کرنا‘‘ جیسا کہ رجاء اور طمع کا لفظ قرائن وشواہد کی بنا پر کسی فائدہ کی توقع پر بولا جاتا ہے۔ خوف کی ضد امن ہے اور یہ امورِ دُنیوی واخروی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ﴾ (بنی اسراء یل:۵۷) ’’اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں‘‘۔ ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾ (السجدۃ :۱۶) ’’ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں۔‘‘

’’خوفِ الٰہی‘‘ کا مفہوم

اَلخوفُ مِنَ اللّٰہِ (یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے) کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ جس طرح انسان شیر کے دیکھنے سے ڈر محسوس کرتا ہے اسی قسم کا رعب اللہ تعالیٰ کے تصور سے انسان کے قلب پر طاری ہوجائے‘ بلکہ خوفِ الٰہی کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہوں سے بچتا رہے اور طاعات کو اختیار کرے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ جو شخص گناہ ترک نہیں کرتا وہ خائف یعنی اللہ سے

ڈرنے والا نہیں ہوسکتا—— اللہ تعالیٰ کے لوگوں کو ڈرانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگوں کو برے کاموں سے بچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ﴿ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ﴾ (الزمر:۱۶) ’’یہ وہ (عذاب) ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے‘‘ بھی اسی معنی میں محمول ہے۔

خشیت‘ وجل‘ رہبہ کا مفہوم

’الخَشیۃ‘ کے معنی بھی خوف کے ہیں‘ مگر خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی عظمت کی وجہ سے دل پر طاری ہوجائے۔ یہ بات عام طور پر اس چیز کا علم ہونے سے ہوتی ہے جس سے انسان ڈرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر:۲۸) ’’بے شک اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحبِ علم ہیں‘‘ میں خشیّتِ الٰہی کے ساتھ علماء کو خاص کیا ہے—— لفظ ’الوَجل‘ بھی خوف کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے مگر اس سے مراد وہ خوف ہے جو دل ہی دل میں محسوس کیا جائے۔ یہ باب وَجِلَ یَوْجَلُ کا مصدر ہے جس کے معنی ڈرنے یا گھبرانے کے ہیں۔ سورۃ الانفال میں فرمایا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ (آیت۲) ’’مؤمن تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں‘‘—— اَلرَّھْبُ وَالرَّھْبَۃُ کا مطلب بھی خوف ہے مگر ایسا خوف جس میں احتیاط اور اضطراب بھی شامل ہو۔ قرآن میں ہے: ﴿لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (الحشر:۱۳) ’’تمہاری ہیبت تو ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر ہے‘‘۔ ﴿يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا﴾ (الانبیاء:۹۰) ’’(ہمارے فضل کی) توقع اور (ہمارے عذاب کے) خوف سے ہمیں پکارتے ہیں‘‘۔ ﴿وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾ (البقرۃ) ’’اور مجھ ہی سے ڈرو۔‘‘

اللہ کے صالح بندوں کا اہم وصف

اللہ تعالیٰ کے صالح‘ مطہر اور ایمانی حلاوت سے سرشار بندوں کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ جب ان کے سامنے ربّ ذوالجلال کا ذکر کیا جائے‘ اس کی عظمت ورفعت اور علوِشان بیان کی جائے تو وہ متفکّر ہوکر اپنے احوال واعمال پر نظر دوڑانے لگتے ہیں‘ اس کی قہاریت اور جباریت کے تصوّر سے وہ سہم جاتے ہیں‘ اس کے خوف سے ان پر کپکپی طاری ہونے لگتی ہے‘ ان کے قلوب میں ایک کہرام مچ جاتا ہے‘ اور اس کی ہیبت انہیں افسردہ ونالیدہ بنا دیتی ہے۔ اور جب اس کی غفاریت کا مژدۂ جانفزا سنتے ہیں تو سکینت وطمانیت سے آسودۂ خاطر ہوتے ہیں۔ سورۃ

الانفال میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۝۲﴾

''سچے اہلِ ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں۔''

اس آیۂ کریمہ میں جس خوف اور ہیبت کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ اس ڈر کی مانند ہرگز نہیں ہے جو کسی درندے یا دشمن کی بدولت دل کا سکون اُچک لیتا ہے' بلکہ یہ خوف وہ ہے جو اُس قادر و قیوم کی جلالتِ شان کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کی آیاتِ مقدّسہ سے تو ان مؤمنین کے ایمان کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے اور شرح صدر کی گراں بہا دولت میسّر آتی ہے اور مزید گناہ سے طبعی نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

صداقت شعار اصحابِ علم کا خاصّہ

سورۃ المائدۃ میں ان صداقت شعار اصحابِ علم و فضل کا ذکر کیا گیا ہے جو قرآن حکیم کی سماعت سے آسودہ اور لذت اندوز ہوئے اور وقفِ گریہ و بکاء ہو کر رہ گئے' ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور زبان پر ''رَبَّنَا اٰمَنَّا'' کے کلمات جاری ہو گئے۔ فرمایا:

﴿وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰٓی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ ۝۸۳﴾ (المائدۃ)

''اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں (اور) وہ بول اٹھتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے پس ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔''

خوف و خشیّت کے اثرات

جن لوگوں کے ذہنوں میں اس علیم و قدیر پروردگار کی عظمت و جلال کا اثر غالب ہو' قیامت کی ہولناکیوں کا احساس جاگزیں ہو' یہ شعور پختہ اور راسخ ہو کہ وہ صرف اسی کی بندگی اور غلامی کے مکلّف ہیں' اور اپنی غلطیوں' کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کا صحیح ادراک ہو تو وہ آخرت کے خوف سے لرزہ براندام ہو جاتے ہیں' قرآن میں عذابِ جہنم کی وعید پڑھ کر وہ چیخ اٹھتے ہیں'

خوف و خشیت سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں' اور ان پر گریہ وزاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ وَیَزِیْدُھُمْ خُشُوْعًا ۝۱۰۹﴾ (بنی اسراء یل) ''اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور (اس قرآن کو سن کر) ان کا خشوع بڑھ جاتا ہے''۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کی روشنی میں خوفِ الٰہی کے آنسوؤں سے تر چہرہ دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ یَخْرُجُ مِنْ عَیْنَیْہِ دُمُوْعٌ وَاِنْ کَانَ مِثْلَ رَأْسِ الذُّبَابِ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ ثُمَّ تُصِیْبُ شَیْئًا مِنْ حُرِّ وَجْھِہٖ اِلَّا حَرَّمَہُ اللّٰہُ عَلَی النَّارِ)) (۱)

''اللہ کے خوف اور ہیبت سے جس بندۂ مؤمن کی آنکھوں سے آنسو نکلیں اگرچہ وہ (مقدار میں بہت کم مثلاً) مکھی کے سر کے برابر (یعنی ایک قطرہ ہی کے بقدر) ہوں' پھر وہ آنسو بہہ کر اس کے چہرہ پر پہنچ جائیں تو اللہ تعالیٰ اس چہرہ کو آتش دوزخ کے لیے حرام کر دے گا۔''

اللہ کے خوف اور ہیبت سے رونگٹے کھڑے ہونا

خوف و خشیت اور ہیبت حقیقت میں قلبی کیفیات ہیں جو جسمانی تغیّر و تبدّل کا باعث بنتی ہیں۔ بشاشت اپنا اثر دکھاتی ہے اور حزن و ملال کے اثر کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ خوف و خشیت کی بدولت بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب اللہ کی خشیت سے اشکوں کی برسات شروع ہو جائے تو وہ خیر و برکت کے اعتبار سے عنبر فشاں ہوتی ہے۔ آتشِ دوزخ کے حرام ہونے کی خوشخبری ایسے ہی اہلِ ایمان کے لیے ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ:

((اِذَا اقْشَعَرَّ جِلْدُ الْعَبْدِ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ تَحَاتَّتْ عَنْہُ خَطَایَاہُ کَمَا تَحَاتُّ عَنِ الشَّجَرَۃِ الْبَالِیَۃِ وَرَقُھَا)) (۲)

''جب اللہ کے خوف اور اس کی ہیبت سے کسی بندہ کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں تو اُس وقت اس کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے کسی پرانے سوکھے ہوئے درخت کے پتے جھڑتے ہیں۔''

اس حدیث کی تائید سورۃ الزمر کی اس آیۂ کریمہ سے بھی ہوتی ہے:

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ﴾ (الزمر:۲۳)

''اللہ نے بہترین کلام اُتارا ہے ایک کتاب کی صورت میں جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں، جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں۔ اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں، پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہوکر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہوجاتے ہیں۔''

گویا ان پر جب خوف اور رعب کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو ان کا قلب وقالب اور ظاہر و باطن اللہ کی یاد کے سامنے جھک جاتا ہے اور اللہ کی یاد ان کے بدن اور روح دونوں پر ایک خاص اثر پیدا کرتی ہے۔ امام بغوی نے تفسیر معالم التنزیل میں اپنی سند کے ساتھ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت درج کی ہے:

''حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی دادی حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ جب اصحابِ رسول کے سامنے قرآن پڑھا جاتا تھا تو ان کا کیا حال ہوتا تھا؟ انہوں نے جواب دیا: ان کا وہی حال ہوتا تھا جس کا بیان قرآن میں ہے: ''ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے اور ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔''

اہلِ ایمان کا لرزہ براندام ہونا

ایمان، جن کے فکر و خیال اور ذہن میں رچا بسا ہو، اللہ کا ذکر سن کر ان پر لرزش طاری ہوجاتی ہے اور وہ خوف سے کانپنے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝﴾ (المؤمنون)

''اور جن کا حال یہ ہے کہ دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور ان کے دل اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ کے بارے میں دریافت کیا: یارسول اللہ! کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص شراب نوشی کرتے ہوئے اور چوری کرتے ہوئے اللہ سے ڈرے؟ جواب میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لَا، يَا بِنْتَ الصِّدِّيْقِ وَلٰكِنَّهُمُ الَّذِيْنَ يَصُوْمُوْنَ وَيُصَلُّوْنَ وَيَتَصَدَّقُوْنَ وَهُمْ يَخَافُوْنَ اَنْ لَا يُقْبَلَ مِنْهُمْ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ﴾))(۳)

''نہیں، اے صدیق کی بیٹی! اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، صدقہ دیتے ہیں اور پھر اللہ عزوجل سے ڈرتے ہیں اس بات سے کہ کہیں یہ اس کے ہاں قبول نہ ہو۔ یہی لوگ ہیں جو صدقہ وخیرات میں جلدی کرتے ہیں۔''

سورۃ الحج میں فرمایا:

﴿وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۝۳۴ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳۵﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) بشارت دے دو عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو، جن کا حال یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں، اور جو مصیبت بھی ان پر آتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

صاحب تفہیم القرآن نے لکھا ہے کہ ''مُخبِتین'' میں تین مفہوم شامل ہیں: (۱) استکبار اور غرورِ نفس چھوڑ کر اللہ کے مقابلہ میں عجز اختیار کرنا (۲) اس کی بندگی اور غلامی پر مطمئن ہوجانا (۳) اس کے فیصلوں پر راضی ہوجانا۔

اللہ کے ہاں یہ ایک محبوب اور مطلوب کیفیت ہے کہ ذکر اللہ ہو تو دل لرز جائیں اور کانپ جائیں۔ اگر یہ کیفیت حقیقی معنوں میں ہو، تصنع سے خالی ہو تو یہ بے عملی کی نقیض ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ کا اُسوہ

حضور نبی کریم ﷺ کا اُسوۂ حسنہ یہ تھا کہ وہ اپنے منصبِ جلیلہ کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے ہمہ وقت فکرمند رہتے اور فکرِ آخرت انہیں متفکر کیے رکھتی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ کو کبھی قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا۔ آپؐ زیادہ سے زیادہ تبسّم فرماتے تھے، حالانکہ آپؐ کی طبیعت میں ظرافت بھی تھی اور حسن مزاح بھی تھا، مگر زندگی توازن و اعتدال کا حسین امتزاج تھی۔ آپؐ فرماتے تھے کہ وہ اپنے عمل اور عبادت سے نہیں بلکہ ربّ رحیم و کریم کے رحم و کرم ہی سے جنت میں جاسکیں گے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا عَصَفَتِ الرِّيْحُ قَالَ: ((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ خَيْرَهَا وَخَيْرَ مَا فِيْهَا وَخَيْرَ مَا اُرْسِلَتْ بِهٖ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيْهَا وَشَرِّ مَا اُرْسِلَتْ بِهٖ)) قَالَتْ: وَاِذَا تَخَيَّلَتِ السَّمَاءُ تَغَيَّرَ لَوْنُهٗ وَخَرَجَ

وَدَخَلَ وَاَقْبَلَ وَاَدْبَرَ فَاِذَا مَطَرَتْ سُرِّیَ عَنْهُ فَعَرَفْتُ ذٰلِكَ فِیْ وَجْهِهٖ قَالَتْ عَائِشَةُ: فَسَاَلْتُهٗ فَقَالَ: ((لَعَلَّهٗ یَا عَائِشَةُ كَمَا قَالَ قَوْمُ عَادٍ ﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِیَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾)) (۴)

''رسول اللہ ﷺ کا حال یہ تھا کہ جب ہوا زیادہ تیز چلتی تو آپؐ کی زبان پر دُعا جاری ہو جاتی ((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ..... الخ)) ''اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اس ہوا کی بھلائی کا' اور اس میں جو کچھ ہے اس کی بھلائی کا' اور جس مقصد کے لیے یہ بھیجی گئی ہے اس کی بھلائی کا۔ اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس کے شر سے' اور اس میں جو کچھ ہے اس کے شر سے' اور جس مقصد کے لیے یہ بھیجی گئی ہے اس کے شر سے''۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ جب آسمان پر ابر آتا تو آپؐ کا رنگ بدل جاتا اور (اضطراب کی یہ حالت ہوتی) کہ کبھی باہر آتے اور کبھی اندر جاتے' کبھی آگے آتے کبھی پیچھے ہٹتے اور پھر جب بارش ہو جاتی (اور خیریت سے گزر جاتی) تو یہ کیفیت آپ سے دور ہو جاتی — حضرت عائشہ صدیقہ ؓ نے آپؐ کی اس حالت کو سمجھ لیا اور آپؐ سے پوچھا (کہ تیز ہوا اور ابر کو دیکھ کر آپ ﷺ کی یہ کیفیت کیوں ہو جاتی ہے؟)۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اے عائشہ! (میں ڈرتا ہوں کہ شاید ابر و باد) اس طرح کا ہو (جو حضرت ہود ؑ کی قوم) عاد کی طرف بھیجا گیا تھا (جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح کیا گیا ہے) ''جب ان لوگوں نے اس بادل کو اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ ابر تو ہمارے لیے بارش لانے والا ہے (حالانکہ وہ بارش والا ابر نہ تھا بلکہ آندھی کا ہلاکت خیز طوفان تھا جو ان کو تباہ کرنے ہی کے لیے آیا تھا)۔''

نبی مکرم ﷺ اور رقتِ قلب کی کیفیت

حضور نبی محترم ﷺ کی رقتِ قلب کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ جب قرآن سنتے تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ نمازوں میں بھی آپؐ پر شدید گریہ طاری ہو جاتا۔ حضرت مطرف ؓ بواسطہ اپنے والد کے روایت کرتے ہیں:

اَتَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ وَهُوَ یُصَلِّیْ وَلِجَوْفِهٖ اَزِیْزٌ كَاَزِیْزِ الْمِرْجَلِ یَعْنِیْ یَبْكِیْ (۵)

''میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا' آپؐ نماز پڑھ رہے تھے اور رونے کی وجہ سے آپؐ کے سینہ سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے (چولہے پر اُبلتی ہوئی) ہنڈیا سے آتی ہے۔''

رونے کی یہی کیفیت آپ ﷺ پر اس وقت بھی طاری ہوتی جب آپؐ قرآن سنتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِقْرَأْ عَلَیَّ)) قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَقْرَأُ عَلَیْكَ وَعَلَیْكَ اُنْزِلَ۔ قَالَ: ((اِنِّیْ اَشْتَهِیْ اَنْ اَسْمَعَهٗ مِنْ غَیْرِیْ)) قَالَ: فَقَرَأْتُ النِّسَاءَ حَتّٰی اِذَا بَلَغْتُ ﴿فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِیْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ شَهِیْدًا﴾ قَالَ لِیْ: ((كُفَّ اَوْ اَمْسِكْ)) فَرَاَیْتُ عَیْنَیْهِ تَذْرِفَانِ (۶)

''مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ''۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا میں آپؐ کو قرآن پڑھ کر سناؤں حالانکہ قرآن آپؐ پر تو نازل ہوا ہے۔ فرمایا: ''میں پسند کرتا ہوں کہ کسی دوسرے سے قرآن سنوں''۔ میں نے آپؐ کے سامنے سورۃ النساء پڑھی حتیٰ کہ اس آیت تک پہنچ گیا: ﴿فَكَیْفَ اِذَا جِئْنَا .....﴾ ''تو کیا ہو گا جب ہم لائیں گے ہر اُمت سے ایک گواہ اور لائیں گے آپؐ کو گواہ ان سب پر''۔ تو آپؐ نے مجھ سے فرمایا: ''بس کافی ہے''۔ پس میں آپ کی طرف متوجہ ہوا تو آپؐ کی آنکھیں اشک بار تھیں۔''

صحابہ کرام ؓ کا حسن کردار

صحابہ کرام ؓ اقامت دین کے اہم ترین مشن میں ہر مرحلہ میں اپنے رہبرِ کامل اور محسنِ اعظم ﷺ کے ہم رکاب رہے۔ انہوں نے آپؐ کی پاکیزہ سیرت کے تمام نقوش اپنے اندر جذب کیے۔ خوف و خشیت ان پر بھی اسی طرح مستولی تھا اور حضور ﷺ کے نقوشِ پا ہی ان کی زندگی کا مرکز و محور تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے قلب کی رقت کا یہ عالم تھا کہ جب قرآن پڑھتے تو اپنے آنسو ضبط نہ کر پاتے۔ تلاوتِ قرآن کے دوران اس طرح روتے کہ ان کے گریہ و بکا کو سن کر لوگ مجتمع ہو جاتے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی شدتِ مرض میں جب جناب ابوبکر کو امامت کے منصب پر فائز کرنا چاہا تو آپ ﷺ کی رفیقۂ حیات حضرت عائشہ صدیقہ ؓ نے فرمایا کہ وہ رقیق القلب انسان ہیں' نماز میں ان پر گریہ غالب آ جائے گا اور وہ مقتدیوں کو قراءت و تکبیر بھی نہ سنا سکیں گے۔

حضرت فاروق اعظم ؓ بھی اسی کاروانِ عشق و محبت کے سفیر تھے' ان کی کیفیت بھی اپنے ان عظیم ساتھیوں سے مختلف نہ تھی۔ ایک دن گشت پر نکلے تو انہیں ایک گھر سے قرآن پڑھنے کی آواز آئی۔ پڑھنے والا سورۃ الطّور کی تلاوت کر رہا تھا۔ حضرت عمرؓ آسودۂ سماعت

ہونے لگے‘ جب اس نے ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝۷ مَّالَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝۸﴾ کے الفاظ پڑھے تو آپ شدید تاثر کی بدولت دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ گھر پہنچے تو علیل ہو گئے۔ لوگ عیادت کے لیے آتے مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ امیر المؤمنین کی بیماری کیا ہے؟ ایک دن آپؓ صبح کی نماز میں سورۂ یوسف کی تلاوت کر رہے تھے‘ جب ﴿وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ۝۸۴﴾ پر پہنچے تو حالت غیر ہو گئی اور زار و قطار رونے لگے‘ یہاں تک کہ تلاوت ختم کر کے رکوع کرنے پر مجبور ہو گئے۔

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے جذب و انجذاب کا عالم بھی یہی تھا۔ وہ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی اور ان کی داڑھی تر ہو جاتی —— حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خوفِ خدا کا حال یہ تھا کہ جب نماز کا وقت آتا تھا تو کانپ اٹھتے تھے اور ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا‘ اس حالت میں لوگ ان کا حال پوچھتے تو فرماتے تھے کہ اس امانت کے ادا کرنے کا وقت آ گیا جس کو خدا نے آسمان و زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اس کو اٹھا لیا‘ اب میں نہیں جانتا کہ میں اس امانت کو اچھی طرح ادا کر سکوں گا یا نہیں؟ (اُسوۂ صحابہؓ‘ حصہ دوم از عبدالسلام ندوی)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ عذاب الٰہی کے خوف سے فرماتے تھے کہ کاش میں خاک کا ذرہ ہوتا اور ہوا مجھ کو اڑا لے جاتی اور میں پیدا نہ ہوا ہوتا —— جب سورۃ الحجر کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۴۳﴾ ”جہنم ان سب کے اجتماع کی جگہ ہے“ تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اس کو سن کر ایک چیخ ماری اور سر پر ہاتھ رکھ کر بھاگے اور متصل تین دن تک غائب رہے —— حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اللہ عزوجل کے تعلق نے میرا کوئی دوست باقی نہیں رکھا اور قیامت کے خوف نے میرے بدن پر گوشت نہیں چھوڑا —— حضرت زراہ بن اوفی رضی اللہ عنہ نے ایک مسجد میں سورۃ المدثر کی یہ آیت ﴿فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۝۸ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝۹﴾ ”جب صور پھونکا جائے گا‘ تو یہ نہایت سخت دن ہو گا“ پڑھی تو زمین پر گر کر جان دے دی۔ (اُسوۂ صحابہؓ‘ حصہ دوم بحوالہ کتاب اللمع)۔“

اختتامیہ

یہ ہیں سیرت کے خدوخال ان قدسی نفوس کے جو بارگاہ حمدیت میں کمال الحاح و زاری اور عجز و نیاز سے سرنگوں رہتے تھے‘ آخرت کی فکر کا تصور کرتے ہی ان کی آنکھیں نمناک

ہو جاتی تھیں‘ توحید کی شفافیت میں کوئی بال بھی لانے کے روادار نہ تھے‘ صرف اللہ تعالیٰ کو مقتدر اعلیٰ مانتے تھے‘ ہر لحظہ اس کی بندگی و غلامی کے معترف رہتے ہوئے‘ اسی سے ڈرتے تھے اور صرف اسی سے اُمیدیں وابستہ کیے رکھتے تھے‘ اور اللہ سے ڈرنے کو ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیتے تھے۔ قرآن کریم کی اس آیۂ کریمہ کے مصداق: ﴿اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۳﴾ (التوبۃ) ”کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مؤمن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو!“ خوفِ خدا سے تہی ہو کر آج ہم لاتعداد آفتوں کا شکار ہیں‘ دل شکن جھمیلوں میں دھنسے ہوئے ہیں‘ تشتّت و افتراق کی بدولت مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں‘ رنگ و نسل کے تعصب اور اخلاق کی بے شمار رذالتوں نے ہماری پہچان گم کر دی ہے‘ داخلی طور پر سکینت سے محروم اور خارجی اعتبار سے اغیار کے ہاں پابہ زنجیر ہیں۔ ہم یہ حقیقت بھی فراموش کر چکے ہیں کہ ملک خداداد پاکستان اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا تھا اور اسلام پر عمل پیرا ہو کر ہی ہم بحیثیت اُمّتِ مسلمہ اپنا تشخّص لوٹا سکتے ہیں۔

حواشی

(۱) سنن ابن ماجه‘ كتاب الزهد‘ باب الحزن والبكاء۔
(۲) البحر الزخّار المعروف بمسند البزار: ۱۴۹/۴۔
(۳) سنن الترمذی‘ ابواب تفسیر القرآن‘ باب ومن سورة المؤمنون۔
(۴) صحیح مسلم‘ کتاب صلاة الاستسقاء‘ باب التعوذ عند رؤية الريح والغيم والفرج بالمطر۔
(۵) سنن النسائی‘ کتاب السهو‘ باب البكاء فی الصلاة۔
(۶) صحیح البخاری‘ کتاب فضائل القرآن‘ باب البكاء عند قراءة القرآن۔

اخذ و استفادہ

☆ معارف القرآن‘ جلد چہارم‘ مولانا مفتی محمد شفیعؒ
☆ تفہیم القرآن‘ جلد اول تا چہارم‘ سید مودودیؒ
☆ معارف الحدیث‘ مولانا منظور احمد نعمانیؒ
☆ ریاض الصالحین‘ امام نوویؒ
☆ اسلامی تصوف‘ سید احمد عروج قادریؒ
☆ اُسوۂ صحابہؓ‘ جلد دوم‘ از عبدالسلام ندوی
☆ تفسیر عثمانی‘ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
☆ مفردات القرآن

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

رزقِ حلال کی اہمیت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے ہر شخص کو معاشی جدّوجُہد کرنا پڑتی ہے اور اس کے لیے ہر انسان ایک پیشہ اختیار کرتا ہے۔ پیشے کے انتخاب میں سمجھ بوجھ سے کام لینا انتہائی ضروری ہے' کیونکہ اگر ایسا پیشہ اختیار کر لیا جائے جس کے ذریعے حرام یا مشکوک روزی ملتی ہو تو اس سے بڑا خسارے کا سودا اور کوئی نہیں۔ آدمی جو کماتا ہے اس سے اپنے اور اپنے خاندان کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کی چیزیں فراہم کرتا ہے۔ جس طرح ہر چیز کی اپنی مخصوص تاثیر ہوتی ہے اسی طرح حلال روزی سے جو شخصیت نشوونما پاتی ہے' اس کے لیے نیکی اور بھلائی کے کام کرنے آسان ہو جاتے ہیں' جبکہ حرام خور شخص کا جھکاؤ برے کاموں کی طرف رہتا ہے اور نیک کاموں کی طرف اس کا دل آمادہ نہیں ہوتا' یا نیکی کے کام اسے آسان ہونے کے باوجود مشکل نظر آتے ہیں۔ بقول غالب: ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

ایک صاحب متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے' ان کی اولاد نیک' پارسا اور خوش اطوار تھی۔ لوگ ان سے پوچھتے تھے: کیا وجہ ہے کہ آپ کے تمام بچے نماز روزے کے پابند' تعلیم میں سب سے آگے اور اخلاق و عادات میں قابلِ تعریف ہیں؟ ان صاحب کا جواب یہ ہوتا تھا کہ اس میں میری کوئی خاص جدوجہد نہیں' بس اتنا ضرور ہے کہ میں رزقِ حلال پر اکتفا کرتا ہوں اور بچوں کو جائز اور حلال آمدنی سے کھلاتا پلاتا' لباس پہناتا اور دوسری ضروریات پوری کرتا ہوں۔ سچ ہے کہ جیسے پانی پیاس کو مٹاتا اور کھانا بھوک کو ختم کرتا ہے —— پانی اور کھانے کی یہ تاثیر مسلّم ہے اور ہر شخص کے تجربے اور مشاہدے میں ہے —— اسی طرح رزقِ حلال کی تاثیر سے نیکیاں جنم لیں تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔

جو لوگ حصولِ رزق کی جدّوجُہد میں احتیاط سے کام نہیں لیتے انہیں انجام کار بُرے نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات اتنی سچی ہے کہ جتنی آگ کی تپش یا برف کی ٹھنڈک۔ آج معاشرے میں جرائم کی کثرت اور گناہ کے کاموں کی جو بہتات نظر آتی ہے اس کی ایک بڑی اور بنیادی وجہ مالی بدعنوانیاں (corruption) ہے۔ ایسے لوگ خال خال نظر آتے ہیں جو معاشی جدّوجہد میں دیانت' صداقت اور امانت کے حامل ہیں' لیکن یہ وہ لوگ ہیں جن کو اطمینانِ قلب اور ذہنی آسودگی حاصل ہے۔ ان کا ضمیر مطمئن اور باطن پاکیزہ ہے۔ وہ tension کی بیماری سے ناآشنا ہیں۔ مگر اکثریت کا حال یہ ہے کہ انہیں بس روزی چاہیے اور فراواں چاہیے' اس سے انہیں کوئی غرض نہیں کہ وہ جائز ذریعے سے آ رہی ہے یا ناجائز ذریعے سے۔ اس زمانے کی خبر رسول اللہ ﷺ نے بایں الفاظ دی ہے:

((یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یُبَالِی الْمَرْءُ مَا اَخَذَ مِنْهُ اَمِنَ الْحَلَالِ اَمْ مِنَ الْحَرَامِ))(۱)

''لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی اس بات کی پروا نہیں کرے گا کہ وہ حلال طریقے سے کما رہا ہے یا حرام طریقے سے۔''

حرام کمائی کی نحوست اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ حرام کمائی اگر نیکی کے کاموں میں لگائی یا اس میں سے زکوٰۃ ادا کی یا صدقہ دیا تو وہ قبول نہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَکْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حَرَامٍ فَیَتَصَدَّقُ مِنْهُ فَیُقْبَلُ مِنْهُ فَیُبَارَكُ لَهُ فِیْهِ' وَلَا یَتْرُكُهُ خَلْفَ ظَهْرِهٖ اِلَّا كَانَ زَادَهٗ اِلَی النَّارِ' اِنَّ اللّٰهَ لَا یَمْحُو السَّیِّئَ بِالسَّیِّئِ وَلٰكِنْ یَمْحُو السَّیِّئَ بِالْحَسَنِ' اِنَّ الْخَبِیْثَ لَا یَمْحُو الْخَبِیْثَ))(۲)

''ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ کسی ناجائز طریقے سے مال کمائے اور اس میں سے فی سبیل اللہ صدقہ کرے تو اس کا صدقہ قبول ہو' اور اس میں سے خرچ کرے تو اس میں برکت ہو۔ اور جو شخص حرام مال (مرنے کے بعد) پیچھے چھوڑ کے جائے گا تو وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ ہی ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بدی کو بدی سے نہیں مٹاتا بلکہ بدی کو نیکی سے مٹاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ گندگی گندگی کو نہیں دھو سکتی۔''

چونکہ حرام کمائی اللہ کی مقرّر کردہ حدود و قیود کو توڑتے ہوئے حاصل کی جاتی ہے' لہٰذا وہ ناپاک ہوتی ہے۔ گندی چیز تو اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا))(۳)

''بے شک اللہ پاک ہے اور وہ صرف پاک چیز ہی کو قبول کرتا ہے۔''

حرام روزی کمانے والے کی روزی سے صدقہ دیا جائے گا تو وہ عنداللہ قبول نہ ہوگا' البتہ ناجائز کاموں میں وہ خوب خرچ ہوگا۔ ایک فارسی محاورہ ہے: ''مالِ حرام بود بجائے حرام رفت'' کہ حرام سے کمایا ہوا مال تھا حرام جگہ خرچ ہو گیا۔ آج دیکھئے شادی بیاہ کی فضول رسموں پر کس فراخدلی کے ساتھ مال خرچ کیا جاتا ہے۔ موسیقی اور گانے بجانے کی محفلیں سجتی ہیں' بدکار عورتوں پر دولت نچھاور کی جاتی ہے۔ کیا رزقِ حلال میں یہ خاصیت ہے کہ وہ ایسی جگہوں پر خرچ ہو؟ یہ سراسر حرام کمائی ہے جو جوئے اور شراب پر خرچ ہوتی ہے۔ سالِ نو عیسوی کی رات ہو یا بسنت کا تہوار' ویلنٹائنز ڈے ہو یا میراتھن دوڑ' کیا ان منحوس تقریبات کے انعقاد میں کسی متقی پرہیزگار اور حلال خور کا پیسہ خرچ ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ان ناجائز کاموں میں ان شتر بے مہار' آزاد منش' رشوت خور اور جرائم پیشہ لوگوں کا مال خرچ ہوتا ہے جنہوں نے حقوق العباد تلف کر کے' ڈاکے ڈال کر' لوٹ مار کر کے یا کسی دوسرے ناجائز ذریعے سے روپیہ اکٹھا کیا ہوتا ہے اور وہ عاقبت کی فکر سے آزاد زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ نسلی مسلمان ہیں اور انہیں اپنے اسلام کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے دین سے وفادار ہوں اور ان کا آخرت پر پختہ یقین ہو تو وہ ایسا کیوں کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَكُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ كَانَتِ النَّارُ اَوْلٰى بِهٖ))(٤)

''وہ گوشت جنت میں نہ جا سکے گا جس کی نشوونما حرام مال سے ہوئی ہو اور ہر گوشت (جسم) جو حرام مال سے پلا بڑھا ہے دوزخ اس کی زیادہ مستحق ہے۔''

اوّل تو حرام خور کو نیکی کی توفیق نہ ہوگی اور اگر وہ کوئی نیک کام کرے گا بھی تو حرام کی نحوست سے وہ شرفِ قبولیت سے محروم رہے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

((مَنِ اشْتَرٰى ثَوْبًا بِعَشَرَةِ دَرَاهِمَ وَفِيْهِ دِرْهَمٌ حَرَامٌ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهٗ صَلٰوةً مَا دَامَ عَلَيْهِ))(٥)

''جس شخص نے دس درہم میں کوئی کپڑا خریدا اور اس میں ایک درہم حرام کا تھا تو جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر رہے گا اس کی کوئی نماز اللہ کے ہاں قبول نہ ہوگی۔''

حرام مال سے بچنا اس قدر ضروری ہے کہ جس مال میں حرمت کا شک ہے اس کو بھی چھوڑنے کی تاکید کی گئی ہے' کیونکہ اگر شک درست ہو تو حرام مال کے برے نتائج بھگتنے پڑیں

گے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ ' وَاِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ ' وَبَيْنَهُمَا اُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ' فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ ' وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ ' كَالرَّاعِي يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يَّرْتَعَ فِيْهِ ' اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى ' اَلَا وَاِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ))(٦)

''یقیناً حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے' اور ان کے درمیان مشتبہ امور ہیں' جن کے بارے میں اکثر لوگ نہیں جانتے (کہ یہ حلال میں سے ہیں یا حرام میں سے؟) پس جو ان مشتبہات سے بچا رہا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا اور محفوظ رہا۔ اور جو شخص ان مشتبہات میں پڑ گیا وہ حرام میں پڑ گیا۔ (اس کی مثال ایسے ہی ہے) جیسے ایک چرواہا (اپنے جانوروں کو کسی) چراگاہ کے قریب چراتا ہے' قریب ہے کہ وہ جانور اس میں گھس جائیں۔ سن لو! ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی چراگاہ اُس کے حرام کردہ امور ہیں۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ سچے جاں نثار تھے' اس لیے وہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو دل و جان سے نہ صرف تسلیم کرتے تھے بلکہ ان پر عمل کرتے تھے۔ جب انہوں نے حرام کی مذمت رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن لی تو پھر اس کے خلاف کرنے کا تو کوئی سوال نہ تھا۔ ہاں یہ خیال ہر وقت غالب رہتا کہ کسی بھی انداز سے کوئی ناجائز چیز ان کے پیٹ میں نہ چلی جائے۔

ہم مسلمان رسول اللہ ﷺ کے امتی اور ''مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِي'' کے ماننے والے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے جب رزق حرام کی مذمت ہم تک پہنچ گئی اور اصحابِ رسولؐ کا طرزِ عمل بھی ہم نے جان لیا تو اب نافرمانی کی گنجائش تو ختم ہو گئی' اور صرف اپنا جائزہ لینا ہی باقی رہ گیا۔ اگر اپنے لین دین اور کاروبار میں کہیں حقوق العباد کی حق تلفی' شعوری یا غیر شعوری طور پر ہو رہی ہو تو اس کو چھوڑنا ہوگا۔

اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنی اولاد کو کسی ایسے پیشے میں نہیں ڈالنا جہاں سے حرام رزق آتا ہو۔ مثال کے طور پر ایک پیشہ ایسا ہے جس میں سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کیا جاتا ہے اور اس کام کا معاوضہ لیا جاتا ہے' کیا اس طرح آنے والا روپیہ حلال ہو سکتا ہے؟ اسی طرح دوسرے تمام پیشے اور ان کی کمائی ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ صاف ستھرے کام

(بقیہ صفحہ 76 پر)

زکوٰۃ وصدقہ

تطہیر، تزکیہ اور برکت کا باعث

حافظ محمد مشتاق ربانی

آخرت میں کامیابی کا دارومدار تزکیۂ نفس پر ہے۔ جس نے دنیا میں اپنے آپ کو پاکیزہ بنالیا وہ کامیاب ہوگا اور جو اپنے نفس کو پاک رکھنے میں ناکام رہا وہ شرمندہ ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝﴾ (الشمس) ''جس نے (اپنے) نفس کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا وہ خسارے میں رہا''۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا آلائش اور نجاستیں ہیں جس سے نفس کو پاک ہونا چاہیے؟ اس پہلو سے اگر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ نفاق، بخل، شح، حرص وطمع اور حبِ دنیا وغیرہ وہ باطنی بیماریاں ہیں جو تزکیۂ نفس میں رکاوٹ ہیں۔ ان بیماریوں کا علاج انفاقِ مال یعنی زکوٰۃ وصدقات دینے سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ (التوبۃ:۱۰۳)

''(اے نبی ﷺ!) ان کے مالوں میں سے صدقہ لے کر انہیں اس کے ذریعہ سے پاک اور صاف کردیں اور ان کے لیے دعائے (خیر) کریں۔''

اس آیت میں صدقہ کے لفظ سے زکوٰۃ اور خیرات دونوں ہی مراد لیے گئے ہیں۔ بعض مترجمین نے صدقہ کا ترجمہ زکوٰۃ کیا ہے، حالانکہ اگر صدقہ ہی کیا جائے تو زکوٰۃ اس میں خود بخود شامل ہوتی ہے، لیکن اس بحث سے بڑھ کر ہمارے لیے یہ بات زیادہ اہم ہے کہ زکوٰۃ وصدقات نفس کی تطہیر اور تزکیہ کا باعث ہیں۔ تطہیر میں غالب پہلو ظاہری نجاست سے پاک ہونا ہے، اگرچہ یہ لفظ گناہوں سے پاک ہونے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ تطہیر کے ساتھ تزکیہ کا ذکر ہے اور تزکیہ سے مراد اپنے آپ کو باطنی بیماریوں اور اخلاقِ رذیلہ سے بچاتے ہوئے اچھے اوصاف سے متّصف ہونا ہے۔ مولانا صدرالدین اصلاحی ''اسلامی نظامِ معیشت'' میں لکھتے ہیں: ''تزکیہ کا مفہوم یہ ہے کہ کسی چیز کو غیر متعلق اور نامناسب عناصر سے پاک کرکے اسے صحیح رخ پر نشوونما دیا جائے''۔ یہ کام زکوٰۃ وصدقات ہی کرسکتے ہیں۔

زکوٰۃ کے لغوی معنی طہارت و پاکیزگی کے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی نماء یعنی بڑھنے اور نشوونما کے لکھے ہیں۔ زکوٰۃ کے معنی میں یہ اختلاف اس لیے پیدا ہوا ہے کہ بعض ماہرینِ لغت زکوٰۃ کا مصدر ''زکیٰ'' (الف مقصورہ کے ساتھ) بتاتے ہیں، جس کے معنی طہارت و پاکیزگی کے ہیں، اور کچھ ماہرینِ لغت اس کا مصدر ''الزکاء'' (الف ممدودہ کے ساتھ) ذکر کرتے ہیں، جس کے معنی نشوونما اور بڑھنے کے ہیں۔ زکوٰۃ کے مصدر کے بارے میں یہ اختلاف باقی رہنے والا ہے، کیونکہ لغت کے اختلاف کو ختم نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی اس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ زکوٰۃ میں دونوں خوبیاں پائی جاتی ہیں، یعنی زکوٰۃ وصدقات باعث پاکیزگی اور باعث برکت دونوں ہیں۔ زکوٰۃ کی یہ دونوں حیثیتیں مسلّم ہیں۔ زکوٰۃ کی یہ حیثیت کہ اس سے انسان سنورتا ہے، کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں لکھتے ہیں:

> ''معلوم ہونا چاہیے کہ زکوٰۃ میں جن امور کی رعایت کی گئی ہے ان میں سے زیادہ دو مصلحتیں نمایاں ہیں (ایک مصلحت نادار وناتواں لوگوں کی مدد ہے اور دوسری مصلحت) کا انجام نفس کا شائستہ کرنا ہے، اور وہ یہ ہے کہ نفوس کے اندر بخل پایا جاتا ہے اور بخل بدترین اخلاق میں سے اور آخرت کے اندر ضرر پہنچانے والی صفت ہے اور بخیل جب مرجاتا ہے تو اس کا قلب مال کی محبت میں الجھا ہوا رہتا ہے اور اس وجہ سے وہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے، اور جب انسان زکوٰۃ کا عادی ہوجاتا ہے اور بخل کی صفت کو اپنے دل سے دور کردیتا ہے آخرت میں اس کو نفع پہنچتا ہے، اور آخرت کے اندر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے بعد سب اخلاق میں زیادہ تر نفع دل کی سخاوت ہے۔''

زکوٰۃ وصدقہ دینے سے ایک طرف مال کی محبت میں کمی ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ دل کی تطہیر کا ذریعہ ہیں۔ ان سے ایمان مزید گہرا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ (جو اپنا مال اس لیے خرچ کرتے ہیں تاکہ) ''ان کے دلوں میں مضبوطی آئے''۔ اس بارے میں حکیم محمد اسحاق اپنی کتاب ''اسلام کا نظریہ کسب وانفاق'' (ص ۹۶) میں لکھتے ہیں:

> ''اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے پسندیدہ کاموں میں مال خرچ کرنے میں جہاں حُبِّ مال کے نظریہ فاسد پر ضرب لگتی ہے، اس کے ساتھ ہی انسان کے قلب وباطن کی (مال کے لالچ سے) تطہیر ہوتی ہے، ریاونمائش کی آلائش سے بچ کر دینی اور ملی مقاصد میں مال خرچ کرنے سے اس کی روحانیت اور نفسیات پر بھی پاکیزہ اور گہرا اثر پڑتا ہے۔''

ڈاکٹر حمید اللہ اپنی کتاب ''اسلامی ریاست'' میں ذکر کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کی اصطلاح تزکیۂ

نفس کی وجہ سے اختیار کی گئی ہے۔ انہوں نے اپنی اس کتاب کے صفحہ ۵۳ پر زکوٰۃ کا معنی پاک کرنا کے لکھے ہیں۔ زکوٰۃ جہاں نفسِ انسانی کو پاک کرتی ہے وہاں اس کا یہ کردار بھی سامنے رہنا چاہیے کہ یہ ہمارے مالوں کو پاکیزہ بنا کر اللہ تعالیٰ کی نظر میں خوشنما بناتی ہے۔ ساچیکو مراتا رولیم سی چیٹک اپنی کتاب The Vision of Islam (اس کتاب کا اردو ترجمہ محمد سہیل عمر نے ''اسلام اپنی نگاہ میں'' کے عنوان سے کیا ہے) میں لکھتے ہیں: ''زکوٰۃ ہمارے اموال واملاک کو پاک کر کے اسے اللہ کے لیے پسندیدہ بنا دیتی ہے۔''

سورۃ الشّمس کی وہ آیت جس کا ذکر آغاز میں ہوا کہ روزِ قیامت وہ شخص فلاح پائے گا جس نے اپنے نفس کو پاک کیا۔ سورتوں کے مابین ربط و مناسبت ملاحظہ ہو کہ سورۃ الشّمس سے اگلی سورت میں تزکیۂ نفس کا ذریعہ بتایا گیا: ﴿الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ۝۱۸﴾ (الیل) ''جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ پاک ہو''۔ گویا زکوٰۃ وصدقات تزکیۂ نفس کا سب سے بڑھ کر ذریعہ ہیں۔

جہاں تک زکوٰۃ وصدقہ کے باعثِ برکت ہونے کا تعلق ہے' اس سلسلے میں سمجھ لیجیے برکت کے معنی بڑھنا اور کسی چیز میں اضافہ ہونے کے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں چیز میں برکت پڑ گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز کم تھی لیکن وہ پوری طرح کفایت کر گئی' اس چیز کو استعمال کرتے ہوئے کمی کا احساس نہ ہوا۔ زکوٰۃ وصدقہ سے مال بڑھتا ہے اور اس سے برکت بھی آتی ہے۔ ارشاد ہے: ﴿یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۸۶) ''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے''۔ محق کے معنی گھٹانے اور مٹانے کے ہیں اور ارباء کے معنی بڑھانے کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے سود لینے اور دینے سے مال میں برکت مٹا دی اور صدقات دینے کی وجہ سے برکت شامل کر دی۔ یہ گھٹانا اور بڑھانا دنیا کے ظاہری حساب سے بھی ہے اور آخرت کے اعتبار سے بھی۔ جو شخص زکوٰۃ وصدقات دیتا ہے اس کے لیے مزید معاشی وسائل پیدا ہوں گے اور آخرت میں بھی اس کا نامۂ اعمال اجر وثواب سے بھر جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَا تَصَدَّقَ اَحَدٌ بِصَدَقَةٍ مِنْ طَیِّبٍ، وَلَا یَقْبَلُ اللّٰهُ اِلَّا الطَّیِّبَ، اِلَّا اَخَذَهَا الرَّحْمٰنُ بِیَمِیْنِهٖ وَاِنْ كَانَتْ تَمْرَةً، فَتَرْبُوْا فِیْ كَفِّ الرَّحْمٰنِ حَتّٰى تَكُوْنَ اَعْظَمَ مِنَ الْجَبَلِ، كَمَا یُرَبِّیْ اَحَدُكُمْ فَلُوَّهٗ اَوْ فَصِیْلَهٗ)) (صحیح مسلم' کتاب الزکوۃ)

''جو شخص صدقہ دیتا ہے پاک مال سے — اور اللہ قبول نہیں کرتا مگر پاک مال (یعنی حلال کو) — تو رحمان اپنے داہنے ہاتھ سے اس کو لیتا ہے اگرچہ وہ ایک کھجور ہی ہو اور

وہ رحمان کی ہتھیلی میں بڑھتی رہتی ہے' یہاں تک کہ پہاڑ کے برابر ہو جاتی ہے' جیسے کوئی اپنے بچھڑے کو پالتا ہے یا اونٹ کے بچے کو۔''

اور زکوٰۃ وصدقہ سے مال بڑھنے کی بات قرآن کریم کی اس آیت میں بھی وارد ہوئی ہے:

﴿وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا۟ فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝۳۹﴾ (الروم)

''اور جو مال تم سود کے لیے دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے مال میں پل کر بڑھے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا' اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو' اُس کی رضا طلبی میں' تو ایسے دینے والے درحقیقت اپنے مال بڑھاتے ہیں۔''

زکوٰۃ وصدقات تقرب الی اللہ کا بھی ایک اہم ذریعہ ہیں' کیونکہ جو دل پاک وصاف ہوں وہی قربِ الٰہی حاصل کر سکتے ہیں' اور اللہ کی قربت سب سے بڑا اعزاز ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَیَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ﴾ (التوبۃ: ۹۹)

(دیہاتی اہلِ ایمان کا وصف بیان ہو رہا ہے کہ) ''وہ خرچ کرتے ہیں اس سے (ان کا مقصد) اللہ کی قربت اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں لینے کا ہوتا ہے۔''

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے حق میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا ذکر قبل ازیں آیۂ مبارکہ ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً.....﴾ کے ذیل میں ''وَصَلِّ عَلَیْهِمْ'' کے الفاظ میں ہو چکا ہے' کہ آپؐ جب ان سے اللہ کی راہ میں صدقات وصول کریں تو ان کے لیے دعائے خیر کریں۔ اس سے ان کو راحت نصیب ہوتی ہے: ﴿اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ ''بے شک آپؐ کی دعا ان کے لیے باعث سکون ہے''۔ وہ اس دعا سے سکھ حاصل کرتے ہیں۔ ان کے برعکس جو منافقین ہیں وہ زکوٰۃ وصدقات دینے کو تاوان اور بوجھ سمجھتے ہیں۔ ارشاد ہوا: ﴿وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا﴾ ''اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ جو خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہوئے۔''

پس معلوم ہوا کہ زکوٰۃ وصدقات کے معاشرتی سطح پر جو فوائد ہیں وہ اپنی جگہ پر مسلّم ہیں' لیکن زکوٰۃ وصدقہ دینے والے کو اپنی ذات کے حوالے سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اُس کا باطن پاک وصاف ہو جاتا ہے' اس کا مال کنز کے دائرہ سے نکل کر اپنی اصل حالت میں آ جاتا ہے اور پاکیزہ قرار پاتا ہے' جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں قدر والا ہے۔ ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ زکوٰۃ و صدقات دینے والے شخص کے لیے غیب سے معاشی وسائل پیدا کر دیتا ہے اور آخرت میں اس کے لیے بہت بڑا ثواب ہوگا۔ ❁❁❁

اسلامی خلافت — دلیل وقانون کی حکمرانی

مولانا زاہد الراشدی

مولانا زاہد الراشدی صاحب کی ذات دینی وعلمی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ مولانا کا شمار ملک کے معروف جید علماء میں ہوتا ہے۔ 'الشریعہ' کے نام سے ایک وقیع ماہانہ علمی جریدہ اُن کے زیرادارت طبع ہوتا ہے۔ بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی دعوت پر متعدد بار تنظیم اسلامی کے تحت منعقدہ سیمینار اور خلافت کانفرنسوں میں تشریف لاکر "تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی" کا عملی مظاہرہ فرماتے رہے۔ ''اسلامی خلافت'' کے حوالے سے مولانا مدظلہ کا زیرنظر مضمون ایک قابلِ قدر علمی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے' جو روزنامہ 'اسلام' کے شکریہ کے ساتھ نذرِ قارئین ہے۔ اس مضمون میں خلافت کے حوالے سے کم وبیش وہی تصور پیش کیا گیا ہے جس کی طرف بانی تنظیم اسلامیؒ اپنے خطابات اور تالیفات کے ذریعے اہلِ پاکستان کو متوجہ کرتے اور اس کے قیام کی جدّوجُہد کے لیے آمادۂ عمل کرنے کے لیے زندگی کے آخری سانس تک کوشاں رہے۔ مولانا کی زیرنظر تحریر میں چند امور ایسے ہیں جن پر ہمیں تحفّظات ہیں' ان کے حوالے سے چند معروضات اگر اللہ نے چاہا تو 'میثاق' کے آئندہ شمارے میں پیش خدمت کی جائیں گی۔ (مدیر)

''خلافت'' کے لفظی معنی نیابت ہیں' خَلَفَ کے معنی ہیں ''وہ کسی کے پیچھے چلا'' اور کسی کے جانے کے بعد اس کی جگہ سنبھالنے والے کو بھی خلیفہ کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ''خلیفہ'' کا لفظ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے بولا گیا ہے' جس کی ایک تعبیر یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی نسل نے زمین پر بسنے والی پیش رو مخلوق یعنی جنّوں کی جگہ سنبھالی ہے اور وہ ان کے خلیفہ ہیں۔ ایک مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنی خلافت عطا فرمائی ہے کہ زمین میں انسان' اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں' ایک یہ کہ زمین پر بسنے والے

ہزاروں قسم کے جانوروں میں سے زمین پر تصرّف کا ملکہ اور مواقع انسان ہی کو عطا ہوئے ہیں۔ زمین کی سطح پر' اس کے اندر' فضا میں اور سمندر میں بسنے والی مخلوقات کو شمار کیا جائے تو اس کی ہزاروں اَنواع گنی جاتی ہیں' لیکن ان سب میں زمین کے اندر' سطح' فضا اور سمندر میں تصرف کی صلاحیت انسان کو ہی حاصل ہے اور وہی سارے نظام کو کنٹرول کر رہا ہے۔ گویا زمین پر تکوینی تصرّف کی ایک صورت انسان کے پاس ہے۔ جبکہ انسان کے اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی اور دوسری زمینی مخلوقات کے لیے جو نظام اور قوانین مقرر فرمائے ہیں' ان کے نفاذ کی ذمہ داری انسان پر ہے۔ وہ خدا کی زمین پر خدا کا نظام نافذ کرنے پر مامور ہے اور اس کی ڈیوٹی ہے کہ انسانی سوسائٹی اور زمین کا نظام اللہ تعالیٰ کے احکام وقوانین کے مطابق چلائے۔ قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کو خلیفہ کہا گیا ہے اور ارشادِ ربانی ہے کہ:

﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی....﴾ (صٓ:۲۶)

''اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے' پس آپ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کریں اور خواہش کی پیروی نہ کریں۔''

یہاں خلیفہ کا لفظ حکمرانی اور قوانین ونظام کے حوالے سے استعمال ہوا ہے اور سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ یہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ خواہشات کی پیروی اللہ تعالیٰ کی راہ سے ہٹا دیتی ہے اور گمراہ کر دیتی ہے۔ گویا حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب کر کے یہ کہا گیا ہے کہ صحیح قانون وہی ہے جو حق یعنی وحی کی روشنی میں ہو اور انسانی خواہشات پر مبنی والا قانون ونظام گمراہی کا نظام وقانون ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد میں خلافت کا مفہوم اور پس منظر یوں بیان فرمایا ہے کہ:

''بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت انبیائے کرام علیہم السلام کیا کرتے تھے' ایک نبی فوت ہو جاتا تو دوسرا نبی اس کی جگہ آ جاتا' لیکن میرے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا' البتہ خلفاء ہوں گے۔'' (بخاری شریف)

بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت کی مختلف صورتیں تھیں' بعض پیغمبر خود ہی حکمران بھی ہوتے تھے' جیسے حضرت یوسف علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت یوشع بن نون علیہ السلام' حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور بعض نبی بادشاہ گر تھے' جیسے حضرت سموئیل علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے

درخواست کی کہ ان پر کسی کو بادشاہ بنایا جائے تاکہ وہ اس کی قیادت میں ظالم بادشاہ جالوت کے خلاف جہاد کر سکیں' چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت طالوت کو بادشاہ بنا دیا اور ان کی قیادت میں بنی اسرائیل نے جالوت کے خلاف فلسطین میں جنگ لڑی۔ اس جہاد کی بہت سی تفصیلات سورۃ البقرۃ کی آیات میں بیان ہوئی ہیں۔

جناب نبی اکرم ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کی رو سے ''خلافت'' سیاسی معاملات میں جناب نبی اکرم ﷺ کی نیابت کا نام ہے اور اسلام کے سیاسی سسٹم کا بنیادی اصول یہ قرار پاتا ہے کہ وہ سیاسی قیادت جو اس سے پہلے حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کیا کرتے تھے' وہ جناب نبی اکرم ﷺ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو جانے کے بعد اب خلفاء کے ہاتھ میں ہوگی اور یہ خلفاء نبی اکرم ﷺ کی نیابت کریں گے۔ چنانچہ ہمارے فقہائے کرام جب خلافت کی تعریف کرتے ہیں تو یہ فرماتے ہیں کہ اُمت کے اجتماعی معاملات کو چلانا ''نیابتاً عن النبیؐ'' نبی اکرم ﷺ کی نیابت کرتے ہوئے۔ اسی وجہ سے خلیفۂ اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ''خلیفۃُ رسولِ اللّٰہ'' (اللہ کے رسول کا خلیفہ) کہا جاتا تھا اور ان کے بعد ان کے جانشین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ''خلیفۃُ خلیفۃِ رسولِ اللّٰہ'' (اللہ کے رسول کے جانشین کا جانشین) کہا جانے لگا تو ان کو الجھن ہوئی تھی کہ تیسرے اور چوتھے خلیفہ کو کس لقب سے یاد کیا جائے گا؟ ایک دن غالباً حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے انہیں یا امیر المؤمنین کے لقب سے خطاب کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ خطاب صحیح ہے' اب اس کے بعد انہیں امیر المؤمنین ہی کہا جائے۔

یہاں ایک نکتہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی نظام میں ''خلیفہ'' اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں کہلاتا' بلکہ جناب نبی اکرم ﷺ کی نیابت کا حامل تصور کیا جاتا ہے' جیسا کہ فقہائے کرام نے خلیفہ کی تعریف میں لکھا ہے' بلکہ قاضی ابویعلیٰ نے ''الاحکام السلطانیہ'' میں روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ''یا خلیفۃَ اللّٰہ'' کہہ کر خطاب کیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر اسے ٹوک دیا کہ 'لستُ بخلیفۃِ اللّٰہ' أنا خلیفۃُ رسولِ اللّٰہ'' یعنی میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں ہوں' بلکہ جناب نبی اکرم ﷺ کا خلیفہ ہوں۔ اسلامی سیاست کے ایک طالب علم کے طور پر میرا خیال ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ فرما کر خلافت کا ایک بڑا اصول بیان فرمایا ہے اور پاپائیت کی جڑ کاٹ دی ہے۔

پاپائیت کا تصور یہ ہے کہ پاپائے روم جو کیتھولک مسیحیوں کے عالمی مذہبی پیشوا کے طور پر اللہ تعالیٰ کے نمائندہ ہیں اور وہ مذہب کی کسی بات کی جو تشریح کریں' اسے اللہ تعالیٰ کی طرف

سے سمجھا جائے' وہ مذہب کی تعبیر کی فائنل اتھارٹی ہیں' ان کے کسی فیصلے کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر خلیفہ کو بھی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ قرار دیا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ کی حیثیت سے فائنل اتھارٹی تصور کیا جائے گا اور اس کی بات کو چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔ اس کے برعکس نبی اکرم ﷺ کے خلیفہ کے طور پر خلیفۂ وقت قرآن وسنت کا پابند قرار پاتا ہے کہ اس کی ہر بات کی دلیل قرآن کریم سے یا جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت وحدیث سے تلاش کرنا ہوگی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کا منصب سنبھالتے ہی اپنے پہلے خطبہ میں اس بات کو واضح کر دیا اور فرمایا کہ میں قرآن وسنت کی اتباع کا وعدہ کرتا ہوں اور تمہیں حق دیتا ہوں کہ اگر مجھے قرآن کریم یا سنت نبوی کے خلاف چلتا دیکھو تو مجھے سیدھا کر دو۔ اسے دلیل اور قانون کی حکومت کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ایک ایسے قانون ودستور کی پابندی کا اعلان کر رہا ہے' جو نہ اُس نے خود بنایا ہے اور نہ ہی اُسے اس میں ترمیم کا اختیار حاصل ہے۔

بادشاہت میں بادشاہ خود قانون بنانے والا ہوتا ہے اور خود ہی اس میں ترمیم کا اختیار رکھتا ہے' اس لیے اگر بادشاہ قانون کی پابندی کی بات کرتا ہے تو یہ بات درست نہیں ہے۔ جمہوریت میں پارلیمنٹ خود ہی دستور وقانون بناتی ہے اور اس میں ترمیم بھی کر سکتی ہے' اس لیے اس کی طرف سے دستور وقانون کی پابندی کا دعویٰ محلِ نظر ہے۔ ان دونوں کے برعکس اسلامی خلیفہ قرآن وسنت کا پابند ہوتا ہے اور خود حکمران کہلانے کی بجائے جناب نبی اکرم ﷺ کی نیابت کا منصب رکھتا ہے' جبکہ اسے قرآن وسنت میں ردّوبدل یا اس کی من مانی تشریح کا بھی کوئی اختیار نہیں ہے' اس لیے صحیح معنوں میں اگر کسی حکومت کو قانون کی حکومت کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف اسلامی خلافت ہے' جس کی بنیاد قوت یا خاندانی بالادستی پر نہیں' بلکہ دلیل پر ہوتی ہے' اس لیے دنیا کی تاریخ میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد اگر دلیل اور قانون کی بنیاد پر کوئی حکومت قائم ہوئی ہے تو وہ اسلامی خلافت ہے' جس کے بنیادی اصول خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلے خطبہ میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں۔

یہاں ایک اور بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے وصال کے بعد ان کی جانشینی کے بارے میں دو مکتب فکر پائے جاتے ہیں' ایک امامت کا اور دوسرا خلافت کا۔ اہلِ تشیع امامت کے علمبردار ہیں اور اہلِ سنّت خلافت کی بات کرتے ہیں۔ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے ان دونوں میں بنیادی فرق بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں خلافت اور امامت میں درج ذیل فرق پائے جاتے ہیں:

☆ امامت منصوص ہے‘ یعنی اس کا قیام نص اور مبینہ طور پر جناب نبی اکرم ﷺ کی وصیت کے ذریعہ عمل میں آیا اور اس میں اُمت کی رائے کا کوئی دخل نہیں‘ اس لیے اہلِ تشیّع حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں ’’وصی رسول اللہ‘‘ کا عقیدہ رکھتے ہیں‘ جبکہ خلافت منصوص نہیں ہے‘ یعنی خلیفہ کا تقرر کسی نص یا وصیت کے ذریعہ نہیں ہوا‘ بلکہ خلیفہ اوّل کا انتخاب اُمت کی اجتماعی صوابدید کی بنیاد پر عمل میں لایا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے باہمی مشاورت اور عمومی بحث ومباحثہ کے بعد آزادانہ رائے کے ذریعہ جناب نبی اکرم ﷺ کا جانشین منتخب کیا تھا۔

☆ امامت نسبی اور خاندانی ہے کہ جن بزرگوں کو اہل تشیع بارہ اماموں کا درجہ دیتے ہیں‘ وہ ایک دوسرے کے نسبی وارث تھے‘ جبکہ خلافت راشدہ کے چاروں بزرگوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا نسبی وارث نہیں ہے۔

☆ اہلِ تشیّع کے عقیدہ کے مطابق امام معصوم ہے۔ اہل سنت خلیفہ کو معصوم نہیں سمجھتے‘ بلکہ وہ شرعی طور پر مجتہد کا درجہ رکھتا ہے۔ معصوم سے خطا کا احتمال نہیں ہوتا‘ اس لیے اس کی بات حتمی ہوتی ہے‘ جس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا‘ جبکہ مجتہد کے فیصلوں میں خطا وصواب دونوں کا احتمال موجود ہوتا ہے‘ اس کے کسی بھی فیصلے سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا ہے اور خلفائے راشدین کے فیصلوں سے بھی اختلاف کیا جاتا رہا ہے۔

☆ خلیفہ اپنی رعیت اور رائے عامہ کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے‘ جیسا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں نے اپنے ابتدائی خطبوں میں اس کی وضاحت کی ہے‘ جبکہ امام کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔

☆ عوام کو خلیفہ کے احتساب کا حق حاصل ہوتا ہے‘ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک بدوی نے کھلے اجتماع میں چادر کے بارے میں پوچھ لیا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود پر لگائے گئے الزامات کے بارے میں حج کے موقع پر کھلی عدالت لگا کر اپنے حکام سمیت عوامی احتساب کے لیے پیش ہو گئے تھے‘ بلکہ اس عوامی احتساب کا خود سرکاری طور پر اہتمام کیا تھا‘ مگر عوام امام کا احتساب کرنے کا حق نہیں رکھتے‘ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا نمائندہ تصور ہوتا ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔

☆ اثنا عشری اہلِ تشیّع کے ہاں امامت کا تسلسل بارہویں امام پر رک گیا ہے۔ ان کے عقیدہ کے مطابق آخری دور میں انہی کو واپس آنا ہے اور اس فہرست میں مزید اضافہ ممکن نہیں

ہے‘ جبکہ خلافت کا تسلسل ہر دور میں قائم رہا ہے اور آج بھی شرعی شرائط اور طریق کار کے مطابق کسی بھی مسلمان کو خلیفہ منتخب کیا جا سکتا ہے‘ اس لیے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ’’پاپائیت‘‘ اور ’’تھیاکریسی‘‘ کا یہ تصور کہ ایک شخص خدا کے نمائندہ کے طور پر حکومت کرے‘ قانون ودستور کی تعبیر میں حتمی اتھارٹی کا درجہ رکھتا ہو اور کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو‘ یہ تصور اہل سنت کے نظام خلافت میں تو سرے سے موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس کا کوئی امکان ہے‘ البتہ اہل تشیع کے فلسفہ امامت میں اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

اس حوالے سے ایک اور بات بھی ذہن میں رکھ لینی چاہیے کہ آج کے دور میں امامت اور خلافت کے ان دونوں فلسفوں کو دستوری شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے اور خلافت وامامت کی معروف اصطلاحات پر زور دیے بغیر یہ دونوں دستوری ڈھانچے آج موجود ہیں۔ مثلاً ایران کا دستور امامت کے تصور پر تشکیل دیا گیا ہے کہ اصل حاکم تو ’’امامِ غائب‘‘ ہیں لیکن چونکہ ان کی غیبوبیت کا زمانہ ہے‘ اس لیے ان کی نمائندگی وقت کے سب سے بڑے فقیہہ کریں گے‘ جو امام غائب کی نمائندگی اور اختیارات کے ساتھ اصل حاکم ہوں گے‘ اسے ’’ولایتِ فقیہ‘‘ کا عنوان دیا گیا ہے۔ ایرانی انقلاب کے بعد ’’ولایتِ فقیہ‘‘ کا یہ منصب جناب خمینی کے پاس رہا اور ان کی وفات کے بعد سے جناب خامنہ ای اس منصب پر فائز ہیں۔ انہیں ایران کے دستوری وقانونی نظام میں آخری اتھارٹی کا درجہ حاصل ہے۔ وہ حکومت‘ پارلیمنٹ اور عدلیہ سمیت کسی بھی ادارے کے فیصلے کو ویٹو کر سکتے ہیں اور ان کے فیصلے پر نظر ثانی کا اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ گویا وہ ’’امامِ معصوم‘‘ کہلائے بغیر عملاً ’’امامِ معصوم‘‘ ہی ہیں‘ اور میرے خیال میں ’’پاپائیت‘‘ کا تصور بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔

دوسری طرف پاکستان میں ’’قراردادِ مقاصد‘‘ کے ذریعہ یہ اصول طے کیا گیا ہے کہ حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے‘ حکومت عوام کے منتخب نمائندے کریں گے‘ مگر وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے پابند ہوں گے اور قرآن وسنت کے دائرے سے تجاوز نہیں کر سکیں گے۔ میرے خیال میں اگر آج ’’خلافت‘‘ کو دستوری شکل دی جائے تو اس کی بنیاد بھی یہی ہوگی کہ:

☆ اصل حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے۔

☆ خلیفۂ وقت اللہ تعالیٰ کے احکام وقوانین نافذ کرنے میں جناب نبی اکرم ﷺ کا نائب ہے۔

☆ اس کا انتخاب عوامی رائے سے ہوگا۔

☆ وہ اور اُس کی حکومت قرآن وسنت کے مطابق حکومت کرنے کے پابند ہوں گے۔

☆ خلیفہ اور اس کے حکام عوام کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور میں یہ سب اصول ''خلافت'' کی اصطلاح اختیار کیے بغیر شامل کر لیے گئے ہیں' اگر ان پر عمل ہو جائے تو ایک صحیح اسلامی ریاست قائم ہو سکتی ہے۔ ایران کی قیادت اپنے فلسفہ کے ساتھ مخلص ہے اور پورے خلوص و دیانت کے ساتھ اس پر عمل کر رہی ہے' جبکہ پاکستان کے مقتدر طبقات کے نزدیک دستور کی اسلامی حیثیت اور دفعات وقوانین کی پوزیشن صرف شوپیس اور نمائش کی ہے' اس لیے دستور کے ساتھ مسلسل منافقت روا رکھی جا رہی ہے۔۔

اس کے بعد میں اس طرف آؤں گا کہ آج کے دور میں اسلامی خلافت کس طرح قائم کی جا سکتی ہے؟ ہمارے فقہائے کرام نے ''انعقادِ خلافت'' کی جو عملی صورتیں بیان کی ہیں' وہ درج ذیل ہیں:

☆ اُمت اپنی اجتماعی صوابدید پر خلیفہ کا انتخاب کرے' یہ عوامی رائے سے ہو یا اربابِ حل و عقد خلیفہ کا انتخاب کریں' اس کے بارے میں بحث کی گنجائش موجود ہے۔

☆ موجودہ خلیفہ کسی اور کو اربابِ حل وعقد کی مشاورت کے ساتھ اپنا جانشین نامزد کر دے۔

☆ خلیفہ براہِ راست جانشین نامزد کرنے کی بجائے کوئی کمیٹی بنا دے' جو اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لے۔

☆ مجلس شوریٰ خلیفہ کا انتخاب کر لے۔

☆ کوئی شخص جو خلافت کی اہلیت رکھتا ہو' بزور طاقت اقتدار پر قبضہ کر لے اور اُمت اسے قبول کر لے۔

فقہائے کرام کے ہاں مسلّمہ فقہی اصولوں کے مطابق خلافت کے انعقاد کی یہی پانچ صورتیں ہیں' جن میں سے کسی ایک صورت کے ذریعہ خلافت قائم ہو سکتی ہے اور خلیفہ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے آج کے حالات میں دوسری' تیسری اور چوتھی صورت قابل عمل نہیں ہے' اس لیے کہ اس وقت کوئی شرعی خلیفہ موجود نہیں ہے جو کسی کو نامزد کر سکے یا کمیٹی بنا سکے اور کسی شرعی خلیفہ کی مقرر کردہ کوئی شوریٰ بھی موجود نہیں ہے' جو انتخابِ خلیفہ کا حق رکھتی ہو۔

آج کے دور میں خلافت کے قیام کی پہلی اور آخری صورت ہی قابلِ عمل ہے کہ اُمت

خود کسی خلیفہ کا انتخاب کرے یا کوئی اہل شخص طاقت کے ذریعہ کسی مسلم ملک کے اقتدار پر قبضہ کر کے خلافت کا اعلان کر دے' اس لیے میرے خیال میں اب اگر ہم خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں تو عملی صورت یہ ہو گی کہ کسی مسلم ملک کی منتخب پارلیمنٹ خلافت کے نظام کو اپنانے کا فیصلہ کرے اور اس کے تمام شرعی و دستوری تقاضے پورے کرتے ہوئے اپنے ملک کو ''اسلامی امارت'' قرار دے اور چند اسلامی ریاستیں وجود میں آ جانے کے بعد وہ آپس میں مل کر ''خلافتِ اسلامیہ'' قائم کر کے خلیفہ کا انتخاب کر لیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے خلافت کے نظام کو ایک عالمی نظام قرار دیا ہے' جو مختلف ریاستوں اور حکومتوں کے درمیان انصاف کے قیام اور شرعی قوانین کے نفاذ کی نگرانی کرتا ہے' اس لیے علاقائی اسلامی حکومتوں کو خلافت کی بجائے ''امارتِ اسلامیہ'' کا نام دینا ہی زیادہ مناسب ہے' جیسا کہ طالبان نے افغانستان میں شرعی حکومت قائم کرنے کے بعد خلافت کے اعلان کی بجائے اسے ''امارتِ اسلامیہ افغانستان'' قرار دے دیا تھا اور میرے خیال میں یہ انتہائی دانش مندانہ فیصلہ تھا' اس لیے کہ ہر علاقے میں الگ الگ ''خلافت'' قائم ہو گی تو باہمی ٹکراؤ اور خلفشار کی انتہائی افسوسناک صورت حال پیدا ہو جائے گی۔

اس وقت عالمِ اسلام میں خلافت کی بحالی کی بیسیوں تحریکات موجود ہیں' جن میں سے ہر ایک کے ساتھ مناسب مواقع پر تعاون بھی کرتا ہوں' مگر اس وضاحت کے ساتھ کہ ہم خلافت کی بحالی کی جدّوجہد میں تعاون کریں گے لیکن ''خلیفہ'' کا انتخاب اپنے وقت پر منطقی طریقہ کار کے مطابق ہو گا' اس لیے ہم خلافت کے کسی موجودہ امیدوار کی حمایت نہیں کرتے۔ چند سال قبل لندن میں ایک جُبہ قُبہ پہنے ہوئے شخص ایک اجتماع میں ملے' انہوں نے اپنی ہیئت اس طرح کی بنا رکھی تھی جیسے وہ واقعتاً ''خلیفۃ المسلمین'' ہوں۔ انہوں نے کہا کہ وہ جرمنی میں رہتے ہیں' ترکی خاندانِ خلافت سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے خلافت کے استحقاق کا دعویٰ کیا ہے' کچھ لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں' مجھ سے انہوں نے بیعت کا تقاضا کیا' عربی میں گفتگو کر رہے تھے۔ اُن کے استفسار پر میں نے عرض کیا کہ خلافت کی بحالی کے موقف سے ہم متفق ہیں لیکن ''خلیفہ'' کے انتخاب کے اس طریق کار سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ ایک دفعہ جامعہ نصرۃ العلوم میں اسباق کے دوران ایک بزرگ تشریف لائے' جو پاکستان ہی کے ایک علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں' میں اسباق سے فارغ ہو کر ان سے ملا تو انہوں نے بیعت کا تقاضا

رکھ دیا کہ میں امیر المؤمنین ہوں‘ آپ میرے ہاتھ پر بیعت کریں۔ میں نے معذرت کر دی کہ اس طرح کوئی شخص خلیفہ نہیں بن سکتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لاہور میں خلافت کے موضوع پر سیمینار ہوا‘ جس میں مجھے بھی بلایا گیا‘ میں نے خلافت کی اہمیت وضرورت اور برکات وثمرات کے حوالہ سے گزارشات پیش کیں‘ جن کے آخر میں دل لگی کے انداز میں عرض کیا کہ اس ہال میں پانچ چھ خلیفہ نظر آ رہے ہیں‘ اگر لاہور میں اتنے ہیں تو پاکستان میں کتنے ہوں گے‘ پھر عالمِ اسلام کی کیا صورت حال ہوگی اور خلافت کے نام پر کتنی خوفناک دھما چوکڑی مچ جائے گی۔

ایسی صورت حال میں جبکہ پورا مغرب ’’خلافت‘‘ کی واپسی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے اور عالمی قوتوں نے طے کر رکھا ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں خلافت قائم نہیں ہونے دی جائے گی اور نہ ہی شریعت نافذ ہونے دی جائے گی‘ اس ماحول میں خلافت کا قیام بہت سنجیدہ مسئلہ ہے۔ یہ ہماری شرعی ودینی ذمہ داری بھی ہے کہ جلد از جلد خلافت قائم ہو جائے‘ لیکن اس سے کہیں زیادہ یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ خلافت کے نام پر اُمت میں کوئی نیا خلفشار پیدا نہ ہو جائے اور ہم پہلے مسائل کو سمیٹتے سمیٹتے عالم اسلام کے لیے کوئی نیا مسئلہ کھڑا نہ کر دیں۔

جہاں تک خلافت کی ضرورت اور اس کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے‘ فقہائے کرام نے اسے امت کی اجتماعی ذمہ داری اور فرضِ کفایہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں خلافتِ شرعیہ موجود ہو‘ جس سے امت کے افراد متعلقہ امور ومعاملات میں رجوع کر سکتے ہوں تو گزارہ ہو جائے گا لیکن اگر کہیں بھی خلافتِ اسلامیہ کا وجود نہیں ہے تو اُمتِ مسلمہ بحیثیتِ اُمت مجموعی طور پر دینی فریضہ کی تارک اور گناہگار ہوگی۔ میرے خیال میں آج کی صورت حال یہی ہے کہ ہم سب دینی فریضہ کی تارک اور گناہگار ہیں۔ فقہائے کرام نے خلافت کے وجوب پر ایک دلیل یہ دی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے جناب نبی اکرم ﷺ کے وصال کے بعد سب سے پہلے یہی کام کیا تھا‘ حتیٰ کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی تجہیز وتدفین سے بھی اس کو مقدم کیا۔ اس لیے یہ صرف واجب نہیں‘ بلکہ اہمّ الواجبات ہے۔ فقہائے کرام خلافت کے وجوب کی ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ قرآن وسنت کے بہت سے صریح احکام مثلاً جہاد‘ قیامِ عدل‘ حدود کا نفاذ اور بیت المال وغیرہ اس بات پر موقوف ہیں کہ کوئی صاحب اقتدار انہیں قائم ونافذ کرے‘ اور اصول یہ ہے کہ فرض کا موقوف علیہ بھی فرض ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن وسنت کے اجتماعی اور معاشرتی احکام کے نفاذ کے لیے خلافت کا قیام فرض اور واجب ہے۔ اس وضاحت

کی روشنی میں ہم سب ترکِ خلافت کے ذمہ دار ہیں۔ حکمران اس درجہ میں کہ ان کے پاس اختیار ہے‘ مگر وہ نہیں کر رہے‘ جبکہ سیاسی راہنما اور علمائے کرام اس طور پر کہ وہ منظّم محنت کر کے ملک میں ایسی فضا قائم کر سکتے ہیں‘ مگر ان کی اس طرف توجہ نہیں ہے‘ اور خلافت کے احیاء کی جو تحریکیں اس وقت عالمِ اسلام میں موجود ہیں‘ ان میں سے ہر ایک کا ہدف صرف یہ ہے کہ کسی طرح وہ دنیا کے کسی خطہ میں اقتدار حاصل کر لیں اور خلافت کے قیام میں ان کی طرف سے پہل ہو جائے‘ لیکن جو اصل ضرورت ہے کہ اُمت میں عمومی طور پر خلافت کی بحالی کا ذوق بیدار ہو‘ آج کے حالات اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے رائے عامہ کو خلافت کی بحالی کے لیے منظّم کیا جائے اور بھرپور عوامی قوت کے ساتھ خلافت کے قیام کی جدوجہد کی جائے‘ یہ کام دنیائے اسلام میں کسی جگہ بھی نہیں ہو رہا۔ اس کے برعکس ’’امامت‘‘ کا تصور رکھنے والوں نے مربوط اور منظّم محنت کر کے اسے نہ صرف عملاً قائم کر لیا ہے‘ بلکہ کامیابی کے ساتھ اسے چلا بھی رہے ہیں۔

ایران میں شاہ کے خلاف مذہبی طبقہ نے بیداری اور بے زاری دونوں کا پوری قوت کے ساتھ اظہار کیا۔ جناب خمینی صاحب نے اپنی جدوجہد اور محنت کا ہدف یونیورسٹیوں کو بنایا‘ ان کے اساتذہ وطلبہ کی ذہن سازی کی‘ انہیں اپنے مذہبی فلسفہ کے مطابق حکومت کی تشکیل اور اس میں مختلف شعبوں میں خدمات سرانجام دینے کے لیے تیار کیا‘ رائے عامہ کو منظّم کیا‘ شاہ ایران کے خلاف ذہن رکھنے والے تمام طبقوں حتیٰ کہ قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کو بھی ساتھ ملایا اور تمام شاہ مخالف قوتوں کو جمع کر کے پہلے شاہ کو شکست دی اور پھر اپنی تربیت‘ ذہن سازی اور منظّم تیاری کی بنیاد پر حکومت پر قبضہ کر کے کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کو دھیرے دھیرے پس منظر کی طرف دھکیل دیا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس انقلاب کے بعد زندگی کے مختلف شعبوں کو سنبھالنے اور ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے تربیت یافتہ اور ذہنی طور پر پختہ افراد کی کھیپ موجود تھی‘ جس نے انقلاب کے بعد ملک کے نظام کو سنبھال لیا اور اب تک سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس سب کچھ کی تیاری انقلاب کے بعد نہیں کی گئی‘ بلکہ انقلاب سے پہلے یہ سارے کام درجہ بدرجہ مکمل ہو چکے تھے‘ اس لیے ان کا انقلاب کامیاب ہوا اور کامیابی کے ساتھ چل بھی رہا ہے۔ مگر ہمارے ہاں صورت حال کیا ہے؟ مجھے اگر اس گستاخی پر معاف کر دیا جائے تو عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمارے ہاں خلافت کی تمام تر بحث صرف ایک دو نقطوں کے گرد

گھومتی ہے کہ ''خلیفۂ اوّل'' کون تھے اور خلافتِ راشدہ میں کون کون بزرگ شامل ہیں؟ ان دو باتوں سے ہٹ کر خلافت کا کوئی اور پہلو ہمارے ہاں سرے سے زیر بحث نہیں آتا اور نہ ہی ہم اس پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں' حالانکہ خلافت کا اپنا ایک مستقل نظام ہے' جو سیاسی بھی ہے' معاشی بھی ہے' انتظامی بھی ہے' معاشرتی بھی ہے۔

آج کی دنیا جن معاشی مشکلات سے دوچار ہے' خود دنیا نے اس کے معاشرتی پہلو کا حل یہ نکالا ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرح ''ویلفیئر اسٹیٹ'' کا اصول اپنایا ہے۔ برطانیہ اور ناروے سمیت بعض مغربی ملکوں نے حضرت عمرؓ کے بیت المال کے نظام پر ریسرچ کی ہے اور اس کا بہت سا حصہ اپنے نظام میں شامل کیا ہے' جس کا وہ اعتراف بھی کرتے ہیں' لیکن ہم مسلمانوں کے علمی و سیاسی حلقوں کو اس کی توفیق نہیں ہے کہ وہ آج کے حالات اور معاشرتی ضروریات کو سامنے رکھ کر خلافت راشدہ کے معاشی نظام اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کے بیت المال کے سسٹم کی اسٹڈی کریں اور اسے آج کی اصطلاحات میں ایک پورے نظام کی شکل دیں۔ میں مثال کے طور پر ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔

امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلافت کے منصب پر فائز ہوئے تو انہیں سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش تھا کہ بیت المال کے دو تہائی سے زیادہ اثاثے حکمران خاندان کے قبضے میں تھے اور قومی خزانہ خالی تھا۔ انہوں نے قومی خزانے کے یہ اثاثے واپس لینے کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے فدک کا باغ واپس کیا' جو اُن کے ذاتی قبضہ میں تھا' پھر اپنی اہلیہ فاطمہ بنت عبدالملک کے زیورات اتروا کر بیت المال کو واپس بھجوائے اور پھر حکمران خاندان کا اجتماع کر کے ان سے تقاضا کیا اور چند ہفتوں کے اندر وہ بیت المال کے اثاثے واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمارا آج کا سب سے بڑا مسئلہ بھی یہی ہے کہ قومی خزانہ خالی ہے اور ملکی دولت بڑے لوگوں کے بیرونی اکاؤنٹس میں منتقل ہو چکی ہے اور اس کی واپسی کے لیے چیخ و پکار جاری ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے' اگر ہم آج کے مسائل کو سامنے رکھ کر خلافتِ راشدہ کے نظام کو ان کے حل کے طور پر پیش کریں اور عام لوگوں کو سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں تو خلافت کے نظام کے قیام کے لیے اُمت کو تیار کرنا زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔

❁❁❁

اپریل فول

مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کی سازش

حافظ محمد زاہد☆

کسی بھی قوم کی جداگانہ حیثیت اور امتیازی شان اس کے عقائد ونظریات اور تہذیب و تمدّن میں پوشیدہ ہے۔ جب کوئی قوم ان میں سے کسی ایک سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تو اس کی امتیازی شان ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی تہذیب اور ثقافت کو چھوڑ کر کسی دوسری قوم کی تہذیب وثقافت کو اپنا لے تو وہ اسی قوم کا فرد شمار ہوگا جس کی تہذیب اس نے اختیار کی ہے۔ مثلاً اگر کوئی ہندو مسلمانوں کا رہن سہن اپنا لے اور مسلمانوں کے طور طریقوں پر اپنی زندگی بسر کرنا شروع کر دے تو لوگ اسے مسلمان سمجھیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان ہندوانہ طرز زندگی اختیار کر لے تو اسے بھی یہی سمجھا جائے گا کہ وہ عقیدتاً مسلمان ہے لیکن عملاً ہندو ہے۔

اس تناظر میں تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود و ہنود اور نصاریٰ ازل سے ہی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال بنتے آئے ہیں۔ کبھی تو انہوں نے علی الاعلان مسلمانوں کو نقصان پہنچایا اور کبھی آستین کے سانپ بن کر۔ دوسری طرف آج کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کی نظریں غیر مسلموں کی تہذیب وتمدن کی جانب بڑے مرعوبانہ انداز میں اٹھتی ہیں جس کا اجتماعی مظاہرہ غیر مسلموں کے تہواروں (مثلاً بسنت 'نیو ایئر نائٹ' ویلنٹائنز ڈے اور اپریل فول وغیرہ) کے مواقع پر نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کے ان حالات وواقعات کا مرثیہ علامہ اقبال نے اس انداز میں کہا ہے:

وضع میں تم ہو نصاریٰ' تو تمدن میں ہنود
یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

ان مغربی تہواروں میں ایک تہوار ''اپریل فول'' ہے جو ہمارا آج کا موضوع ہے—

☆ ادارتی معاون' شعبہ مطبوعات' قرآن اکیڈمی' لاہور pmzahids@yahoo.com

اپریل کی آمد آمد ہے اور دنیا بھر میں جھوٹ کے نت نئے ریکارڈ قائم کرنے اور عوام الناس کو نت نئے جھوٹ بول کر اپنے مذاق کا نشانہ بنانے اور اس مذاق میں اپنے پیاروں کو نقصان پہنچانے کی تیاریاں عروج پر ہیں۔ اپریل فول کا یہ تہوار اپنی ہزار ہا برائیوں کے باوجود اسلامی ممالک بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں تیزی سے فروغ پا رہا ہے اور اس میں زیادہ تر کردار اُن این جی اوز کا ہے جو فلاح و بہبود کی آڑ میں مغربی تہواروں کو نوجوان نسل میں فروغ دے کر انہیں مغربی طرزِ زندگی کا دلدادہ بنا رہی ہیں۔

اس مضمون میں تین عنوانات زیر بحث آئیں گے: (۱) اپریل فول کی تاریخ کیا ہے اور اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ (۲) اسلامی تعلیمات کی رو سے اپریل فول کن گناہوں اور معاشرتی برائیوں کا مجموعہ ہے؟ اور جھوٹ' جو اپریل فول کا لازمی جزو ہے' کی مذمّت میں اسلام نے کیا روش اختیار کی ہے۔ (۳) مزاح کے بارے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں اور اس کا دائرہ کار کیا ہے؟

اپریل فول کی تاریخ

اس رسم کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس بارے میں مؤرخین کے بیانات مختلف ہیں:

(۱) بعض مصنفین کا کہنا ہے کہ فرانس میں سترہویں صدی سے پہلے سال کا آغاز جنوری کے بجائے اپریل سے ہوا کرتا تھا۔ اس مہینے کو رومی لوگ اپنی دیوی وینس (Venus) کی طرف منسوب کر کے مقدس سمجھتے تھے۔ وینس کا ترجمہ یونانی زبان میں Aphrodite کیا جاتا تھا اور شاید اسی یونانی نام سے مشتق کر کے مہینے کا نام اپریل رکھ دیا گیا ہو (برٹانیکا' ج ۸' ص ۲۹۲)— چونکہ یکم اپریل سال کی پہلی تاریخ ہوا کرتی تھی اور اس کے ساتھ ایک بت پرستانہ تقدس بھی وابستہ تھا' اس لیے اس دن لوگ جشن مسرت منایا کرتے تھے اور اسی جشن مسرت کا ایک حصہ ہنسی مذاق بھی تھا جو رفتہ رفتہ ترقی کر کے ''اپریل فول'' کی شکل اختیار کر گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس جشن مسرّت کے دن لوگ ایک دوسرے کو تحفے دیا کرتے تھے' ایک مرتبہ کسی نے تحفے کے نام پر کوئی مذاق کیا جو بالآخر دوسرے لوگوں میں بھی رواج پکڑ گیا۔

(۲) برٹانیکا میں اس رسم کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ۲۱ مارچ سے موسم میں تبدیلیاں آنی شروع ہو جاتی ہیں' ان تبدیلیوں کو بعض لوگوں نے اس طرح تعبیر کیا کہ (معاذ اللہ)

قدرت ہمارے ساتھ مذاق کر کے ہمیں بیوقوف بنا رہی ہے' لہٰذا لوگوں نے بھی ان دنوں میں ایک دوسرے کو بیوقوف بنانا شروع کر دیا۔ (برٹانیکا' ج ۱' ص ۴۹۶)

یہ بات اب بھی مبہم ہی ہے کہ قدرت کے اس نام نہاد مذاق کے نتیجے میں یہ رسم چلانے سے قدرت کی پیروی مقصود تھی یا اس سے انتقام لینا منظور تھا؟

(۳) ایک تیسری وجہ انیسویں صدی کے معروف انسائیکلوپیڈیا ''لاروس'' نے بیان کی ہے اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔ وہ وجہ یہ ہے کہ دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کی بیان کردہ روایات کے مطابق یکم اپریل وہ تاریخ ہے جس میں رومیوں اور یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تمسخر اور استہزا کا نشانہ بنایا گیا۔ موجودہ اناجیل میں اس واقعے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ لوقا کی انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

''جو آدمی اسے (یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کو) گرفتار کیے ہوئے تھے' اس کو ٹھٹھے میں اُڑاتے اور مارتے تھے اور اس کی آنکھیں بند کر کے اس کے منہ پر طمانچے مارتے تھے اور اس سے یہ کہہ کر پوچھتے تھے کہ نبوت (یعنی الہام) سے بتا کہ کس نے تجھ کو مارا؟ اور طعنے مار مار کر بہت سی اور باتیں اس کے خلاف کہیں۔'' (لوقا' باب ۲۲: ۶۳ تا ۶۵)

اناجیل میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کو یہودی سرداروں اور فقیہوں کی عدالت عالیہ میں پیش کیا گیا' پھر انہیں پیلاطس کی عدالت میں لے گئے کہ ان کا فیصلہ وہاں ہوگا' پھر پیلاطس نے انہیں ہیروڈیس کی عدالت میں بھیج دیا اور بالآخر ہیروڈیس نے دوبارہ فیصلے کے لیے ان کو پیلاطس ہی کی عدالت میں بھیجا۔ لاروس کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک عدالت سے دوسری عدالت میں بھیجنے کا مقصد بھی ان کے ساتھ مذاق کرنا اور انہیں تکلیف پہنچانا تھا اور چونکہ یہ واقعہ یکم اپریل کو پیش آیا تھا اس لیے اپریل فول کی رسم درحقیقت اسی شرمناک واقعے کی یادگار ہے۔

مفتی تقی عثمانی اس حوالے سے فرماتے ہیں:

''اگر یہ بات درست ہے (لاروس وغیرہ نے اسے بڑے وثوق کے ساتھ درست قرار دیا ہے اور اس کے شواہد پیش کیے ہیں) تو غالب گمان یہی ہے کہ یہ رسم یہودیوں نے جاری کی ہوگی اور اس کا منشا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تضحیک ہوگی۔ لیکن یہ بات حیرت ناک ہے کہ جو رسم یہودیوں نے (معاذ اللہ) حضرت عیسیٰؑ کی ہنسی اڑانے کے لیے جاری کی' اسے عیسائیوں نے کس طرح ٹھنڈے پیٹوں نہ صرف قبول کر لیا بلکہ خود

بھی اسے منانے اور رواج دینے میں شریک ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عیسائی اس رسم کی اصلیت سے واقف نہ ہوں اور انہوں نے بے سوچے سمجھے اس پر عمل شروع کر دیا ہو۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عیسائیوں کا مزاج اس معاملے میں عجیب و غریب ہے۔ جس صلیب پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے خیال میں سولی دی گئی بظاہر وہ ان کی نگاہ میں قابل نفرت ہوتی کہ اس کے ذریعے حضرت مسیح علیہ السلام کو اذیت دی گئی' لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عیسائی حضرات نے اسے مقدس قرار دینا شروع کر دیا اور آج وہ عیسائی مذہب کے تقدس کی سب سے بڑی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح کا معاملہ عیسائیوں نے اس رسم کے ساتھ کیا ہوا ہے کہ یہ رسم ان کے ہاں قابل مذمت ہونی چاہیے تھی لیکن انہوں نے اس رسم کو اپنا تہوار بنا لیا ہے۔''

نوٹ: اپریل فول کی مندرجہ بالا تاریخ مولانا تقی عثمانی حفظہ اللہ کے مقالہ بعنوان ''اپریل فول'' سے لی گئی ہے۔

اپریل کا دھوکہ: پس منظر

اپریل فول کا لفظی معنی ''اپریل کا دھوکہ'' ہے۔ اس کا پس منظر تاریخ کے اوراق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج سے تقریباً ہزار سال پہلے' جب مسلمان سپین میں برسرِ اقتدار تھے' وہ ایک ایسی طاقت تھے جس کا توڑنا ناممکن تھا اور مغرب کے نصاریٰ یہ تمنا کرتے تھے کہ کسی بھی طرح دنیا سے اسلام کا خاتمہ کر دیں۔ ان لوگوں نے سپین میں اسلام کی بڑھوتری کو روکنے اور اس کا خاتمہ کرنے کی پوری کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ آخر کار کفار نے ایک طرف تو محلاّتی سازشوں کے جال بُنے اور دوسری طرف مسلمانوں کے اخلاق و کردار بگاڑنے کے لیے نت نئی چالیں چلیں۔ انہوں نے سپین میں سگریٹ اور شراب مفت مہیّا کرنے شروع کر دیے۔ اس سے بالخصوص نوجوان نسل اخلاقی بگاڑ کا شکار ہوگئی۔ رفتہ رفتہ نصاریٰ نے اپنی چال بازیوں سے سارے سپین کو اپنے ماتحت کر لیا اور اس ملک سے مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جہاں وہ آٹھ سو برس سے زیادہ مدت تک اقتدار میں رہ چکے تھے۔ یکم اپریل کو مسلمانوں کے آخری قلعہ ''غرناطہ'' کا سقوط ہوا' اس لیے یہ اس دن کو ''اپریل کا دھوکہ'' (April Fool) کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس کے جشن کے طور پر ہر سال اس دن کو مناتے آ رہے ہیں۔ اس دھوکہ دہی کے بعد یہود و نصاریٰ نے ایسا طرزِ عمل اختیار کیا ہے کہ اس دن کی طرح آج تک وہ مسلمانوں کو بیوقوف بنائے ہوئے ہیں۔

اپریل فول: احمقوں اور پاگلوں کا دن

انگریز لوگ اس دن کو ''پاگلوں اور احمقوں کا دن'' (all fool day) کہتے ہیں' اس لیے کہ اس دن جھوٹ صرف لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ یورپ میں اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک انگریزی اخبار نے ۳۱ مارچ ۱۸۴۶ء کو ایک خبر شائع کی کہ کل یعنی یکم اپریل کو فلاں زراعتی فارم میں گدھوں کی نمائش اور عام میلہ منعقد ہو رہا ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے لوگ انتہائی شوق سے مذکورہ فارم میں جمع ہوئے اور میلے کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو انہوں نے پوچھنا شروع کیا کہ میلہ کب شروع ہوگا؟ تب انہیں بتایا گیا کہ آج یکم اپریل یعنی لوگوں کو بے وقوف بنانے کا دن ہے' اس لیے جو لوگ میلہ دیکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں وہ خود گدھے ہیں۔

اپریل فول' گناہوں اور معاشرتی برائیوں کا مجموعہ

اسلامی تعلیمات کی رو سے اپریل فول منانا نہ صرف بالکل ناجائز' بلکہ حماقت ہے' اس لیے کہ اس میں بدترین گناہوں اور بے بہا معاشرتی خرابیوں کی آمیزش شامل ہے۔ ذیل میں ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

جھوٹ اور غلط بیانی

یہ رسم سراسر جھوٹ اور غلط بیانی پر مبنی ہے اور یہ ایسے اخلاقِ ذمیمہ ہیں جن کی مذمت ہر مذہب اور شریعت نے کی ہے' جبکہ شریعت اسلامی میں تو اس کے بارے میں سخت ممانعت اور وعید آئی ہے۔ مؤمن آدمی تو کبھی بھی غلط بیانی اور جھوٹ سے کام نہیں لیتا' اس لیے کہ جھوٹ جہنم کا راستہ ہے اور اس راستہ پر چلنے کا ایک مؤمن آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ کسی آدمی کے دل میں جھوٹ اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے' کیونکہ ایمان کی بنیاد سچائی جبکہ نفاق کی بنیاد جھوٹ پر ہے' لہٰذا ان دونوں کا اجتماع ایک دل میں محال ہے۔ چونکہ اپریل فول میں اصل اور بنیادی چیز جھوٹ ہے اس لیے اس کی مذمت میں چند احادیث ذیل میں بیان کی جا رہی ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اسلامی تعلیمات میں جھوٹ کس قدر اور کن کن پہلوؤں سے قابلِ مذمت اور قابلِ گرفت ہے:

مزاح کے طور پر جھوٹ بولنے کی ممانعت: بعض لوگوں کا یہ گمان ہے کہ مزاح کے طور

جھوٹ بولنا جائز ہے اور اسی کو نام نہاد اور جدّت پسندی کے قائل مسلمان دلیل بنا کر یکم اپریل یا دیگر ایام میں تفریحاً جھوٹ بولنے کو جائز سمجھتے ہیں' حالانکہ یہ سراسر غلط ہے اور شریعتِ مطہرہ میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ جھوٹ بولنا چاہے مذاق کے طور پر ہو یا کسی اور وجہ سے' ہر صورت میں حرام ہے۔ اس حوالے سے ہادیٔ عالم ﷺ کی ایک حدیث ملاحظہ ہو۔ بہز بن حکیم بواسطہ اپنے والد کے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مزاح کے طور پر جھوٹ بولنے والے شخص پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

((وَيْلٌ لِلَّذِيْ يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ، وَيْلٌ لَهُ وَيْلٌ لَهُ))(۱)

''ہلاکت ہے ایسے شخص کے لیے جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے اپنے بیان میں جھوٹ بولے۔ ہلاکت ہے اُس کے لیے' ہلاکت ہے اُس کے لیے!''

جھوٹ منافق کی نشانی: نبی اکرم ﷺ نے جھوٹ کو منافق کی ایک نشانی قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))(۲)

''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے' وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے اور جب اس کو کسی چیز کا امین بنا دیا جائے تو خیانت کرے۔''

مؤمن کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا: جھوٹ ایک ایسی خصلت ہے جس کی مؤمن کی طبیعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ كُلِّهَا اِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكَذِبَ))(۳)

''مؤمن کی طبیعت اور فطرت میں ہر خصلت کی گنجائش ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔''

بچوں کو بہلانے کے لیے جھوٹ کی ممانعت: مائیں بالعموم اپنے بچوں کو بہلانے کے لیے جھوٹ موٹ بات کر دیتی ہیں' مگر تربیتی نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

دَعَتْنِيْ اُمِّيْ يَوْمًا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَاعِدٌ فِيْ بَيْتِنَا، فَقَالَتْ: هَا تَعَالَ اُعْطِيْكَ، فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((مَا اَرَدْتِ اَنْ تُعْطِيْهِ؟)) قَالَتْ:

اُعْطِيْهِ تَمْرًا: فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَمَا اِنَّكِ لَوْ لَمْ تُعْطِهِ شَيْئًا كُتِبَتْ عَلَيْكِ كِذْبَةٌ))(۴)

''ایک دن جبکہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے' میری والدہ نے مجھے پکارا اور کہا: ادھر آؤ' میں تمہیں کچھ دوں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے میری ماں سے فرمایا: ''تم نے اس بچے کو کیا چیز دینے کا ارادہ کیا ہے؟'' میری ماں نے عرض کیا: میں نے اسے ایک کھجور دینے کا ارادہ کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یاد رکھو اگر اس کہنے کے بعد تم اس بچے کو کوئی بھی چیز نہ دیتی تو تمہارے نامہ اعمال میں ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا۔''

جھوٹ سے دل کا سیاہ ہو جانا: انسان جب جھوٹ بولتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ رنگ کا دھبّہ لگ جاتا ہے۔ اگر انسان توبہ کر لے تو وہ دھبّہ مٹ جاتا ہے' ورنہ انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے اور آخر کار اس کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ امام مالکؒ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

لَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَكْذِبُ وَتُنْكَتُ فِيْ قَلْبِهٖ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ حَتّٰى يَسْوَدَّ قَلْبُهٗ كُلُّهٗ فَيُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ (۵)

''آدمی جھوٹ بولتا ہے تو ایک سیاہ دھبّہ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے (وہ جھوٹ بولتا رہتا ہے) یہاں تک کہ اس کا دل بالکل سیاہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ جھوٹوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔''

جھوٹ کی بدبو: جس طرح مادی چیزوں کی خوشبو اور بدبو ہوتی ہے اسی طرح اچھے اور برے اعمال کی بھی خوشبو اور بدبو ہوتی ہے۔ جھوٹ کی بدبو کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَكُ مِيْلًا مِنْ نَتْنِ مَا جَاءَ بِهٖ))(۶)

''جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کے جھوٹ کی بدبو سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔''

ذہنی اور جسمانی اذیت کا باعث

اس تہوار اور رسم کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے معاشرے میں ذہنی و جسمانی اذیت کو فروغ ملتا ہے۔ اس حوالے سے اخبارات میں اکثر یہ پڑھا گیا ہے کہ اپریل فول کے مذاق کی وجہ سے فلاں شخص کو دل کا دورہ پڑ گیا' فلاں حادثے کا شکار ہو گیا اور فلاں کی موت واقع ہو گئی۔ ایسی

خبریں پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ رسم لوگوں کی خوشی کا باعث بننے کے بجائے ان کی ذہنی و جسمانی اذیت کا باعث ہے۔ جبکہ انسان حتیٰ کہ جانور کو بھی اذیت دینا کسی بھی معاشرہ' قانون اور مذہب میں جائز نہیں سمجھا جاتا۔ اسلام نے تو اس حوالے سے بھی سخت روش اختیار کی ہے' بایں صورت کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمان کی تعریف ہی ان الفاظ میں فرمائی ہے:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَ يَدِهٖ))(۷)

''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔''

کُفّار کے ساتھ مشابہت

شریعتِ اسلامیہ نے ہمیں سیدھا راستہ دکھا دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان راستوں کی نشاندہی بھی کر دی ہے جو ضلالت و گمراہی کا باعث ہیں۔ ان میں ایک راستہ کفار کی مشابہت ہے جس سے دین اسلام نے نہایت سختی سے منع فرمایا ہے' جبکہ اس رسم میں یقینی طور پر کفار کے ساتھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ غیروں کی مشابہت اختیار کرنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا ' لَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ وَلَا بِالنَّصَارٰى))(۸)

''جو غیروں کی مشابہت اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ نہ مشابہت اختیار کرو یہود کی اور نہ نصاریٰ کی۔''

ایک روایت میں تو یہاں تک الفاظ ملتے ہیں کہ غیروں کی مشابہت اختیار کرنے والا اُن ہی میں سے شمار ہو گا جن کی اس نے مشابہت اختیار کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ))(۹)

''جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی گویا وہ انہی میں سے ہے۔''

دھوکہ دہی اور معاشرتی انتشار کا باعث

ان کے علاوہ بھی اس رسم میں بے شمار معاشرتی خرابیاں ہیں' مثلاً یہ رسم واضح طور پر معاشرتی انتشار اور فساد کا ذریعہ ہے' اس لیے کہ اس رسم میں جھوٹ بول کر لوگوں کو تکلیف دی جاتی ہے اور بعد ازاں حقیقت کا علم ہونے اور جھوٹ کا پردہ فاش ہونے پر ان میں لڑائی جھگڑا

اور دیگر فسادات مثلاً قطع تعلق جیسا مذموم فعل بھی ہوسکتا ہے ـــــ اس کے ساتھ ساتھ اس رسم سے معاشرے میں دھوکہ دہی بھی رواج پا رہی ہے۔

دین اسلام کی مزاح کے بارے میں تعلیمات

اسلام ایک مکمل دین ہے جو لوگوں پر اتنی سختی نہیں کرتا جس سے ان کا جینا دشوار ہو جائے' بلکہ اسلام تو چاہتا ہے کہ معاشرہ میں لوگ خوش باش رہیں' اس لیے اسلام میں مزاح سے منع نہیں کیا گیا' لیکن مزاح سے مراد کسی کے دل کو خوش کرنا ہے نہ کہ کسی کو ایذا دینا یا اس کا دل دکھانا۔ ایسا مذاق جو کسی کی اذیت یا دل آزاری کا باعث بنے' وہ اسلامی تعلیمات کی رو سے ممنوع ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تُمَارِ اَخَاكَ وَلَا تُمَازِحْهُ وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِدَةً فَتُخْلِفَهُ))(۱۰)

''اپنے (مسلمان) بھائی سے نہ تو جھگڑا کرو' نہ اُس سے مذاق کرو (جو ذہنی و جسمانی اذیت یا دل آزاری کا باعث بنے)' اور نہ ایسا وعدہ کرو جس کو تم پورا نہ کر سکو۔''

البتہ بات کو ایسے انداز میں بیان کرنا جس میں مزاحِ لطیف کا پہلو نکلے' نہ صرف جائز ہے بلکہ ایسا کرنا نبی کریم ﷺ سے بھی ثابت ہے۔ نمونے کے طور پر ذیل میں چند واقعات کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

☆ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: یا رسول اللہ! مجھے کوئی سواری عنایت فرمائیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّا حَامِلُوْكَ عَلٰى وَلَدِ نَاقَةٍ)) قَالَ وَمَا اَصْنَعُ بِوَلَدِ النَّاقَةِ ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((وَهَلْ تَلِدُ الْاِبِلَ اِلَّا النُّوْقُ))(۱۱)

''ہم تجھے اونٹنی کا بچہ دیں گے''۔ وہ بولا: میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ تو آپ ؐ نے فرمایا: ''اونٹنی ہی تو اونٹ کو جنم دیتی ہے۔''

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بوڑھی عورت سے فرمایا:

((اِنَّهُ لَا تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ)) ''کوئی بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی۔''

اس پر اس عورت نے کہا: (بوڑھیوں میں) ایسی کیا بات ہے (جس کی وجہ سے وہ جنت میں نہیں جائیں گی؟) اور وہ بوڑھی قرآن خواں تھی۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا:

((اَمَا تَقْرَئِيْنَ الْقُرْاٰنَ :اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿۳۶﴾))(۱۲)

''کیا تو نے قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھی: ''بے شک ہم ان عورتوں کو نئے سرے سے

پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دیں گے (یعنی بوڑھے لوگ بھی جوانی کی حالت میں جنت میں جائیں گے)۔''

خلاصہ کلام

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اپریل فول کی رسم' جس کی ابتدا خواہ وینس نامی دیوی کی طرف منسوب ہو' یا اسے (معاذ اللہ) قدرت کے مذاق کا ردعمل کہا جائے' یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذاق اڑانے کی یادگار' یا مسلمانوں کے سپین سے انخلا کی یادگار' ہر صورت میں اس رسم کا رشتہ کسی نہ کسی طرح توہم پرستی یا کسی گستاخانہ نظریے سے جڑا ہوا ہے اور اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ رسم بے شمار گناہوں اور معاشرتی برائیوں کا مجموعہ ہے۔ اب مسلمانوں کو خود یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ آیا یہ رسم اس لائق ہے کہ اسے مسلمان معاشروں میں فروغ دیا جائے؟ اس کا جواب سچے مسلمانوں کے نزدیک یقیناً نفی کی صورت میں ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ اور قابلِ غور ہے کہ غیر مسلموں کی رسمیں اور تہوار ان کے اپنے معاشروں سے زیادہ وسطی ایشیا اور بالخصوص اس خطے میں تیزی سے فروغ پا رہی ہیں۔ اس کا ایک سبب تو ہمارا حکمران طبقہ بالخصوص سابق صدر پرویز مشرف ہے جس نے اس خطے میں مصطفیٰ کمال پاشا بننے کی خواہش میں ان تہواروں کو حکومتی سطح پر فروغ دیا اور ''جدّت پسندی'' کے نام پر مغربی طرزِ زندگی اپنانے کی ریت ڈالی۔ دوسرا سبب ہمارا ''آزاد میڈیا'' ہے جو فحاشی اور عریانی کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ جبکہ اس کے بڑے مجرم ہم عوام ہیں' اس لیے کہ ان تہواروں کو منانے کا آخری فیصلہ ہمارا ہوتا ہے' کیونکہ کوئی ہمیں مجبور نہیں کر سکتا کہ ہم ان تہواروں کو اپنائیں۔

افسوس! کہ ہم مسلمان' غیر مسلموں کے تہذیب و تمدن پر مرے مٹے جا رہے ہیں حالانکہ مسلمانوں کے پاس تہذیب و تمدن کے ایسے روشن اور درخشندہ نمونے موجود ہیں جن کی مثال پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے' لیکن افسوس! صد افسوس!! کہ مسلمانوں نے اپنے چراغوں کو بجھا کر غیروں کی طرف رُخ موڑ لیا ہے:

مانگتے پھرتے ہیں اغیار سے مٹی کے چراغ
اپنے خورشید پہ پھیلا دیے سائے ہم نے!

آخر میں اللہ تعالیٰ کے حضور انتہائی عاجزی کے ساتھ دعا ہے کہ وہ مسلمانوں پر یہ بات

روزِ روشن کی طرح عیاں کردے کہ غیر مسلم اپنے تہواروں کو اس خطے میں فروغ دے کر نہ صرف ہمیں اسلام اور اسلامی تہذیب سے دور کر رہے ہیں بلکہ ہمیں کسی نہ کسی درجہ میں ''بیوقوف'' بنا رہے ہیں اور ان کی تہذیب مسلمانوں کے لیے موت سے بھی بدتر ہے:ـ

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگِ اُمومت
ہے حضرت انساں کے لیے اس کا ثمر موت!

اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دعا ہے کہ وہ پوری اُمّتِ مُسلمہ اور خصوصاً اس خطہ میں بسنے والے مسلمانوں کو رسول اکرم ﷺ کے قائم کردہ تہذیب وتمدن کو صحیح معنوں میں اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

حواشی

(۱) سنن الترمذی‘ کتاب الزھد‘ باب فیمن تکلم بکلمة یضحك بھا الناس۔ وسنن ابی داوٗد‘ کتاب الادب‘ باب فی التشدید فی الکذب (واللفظ له)۔

(۲) صحیح البخاری‘ کتاب الایمان‘ باب علامة المنافق۔ **اور متعدد مقامات۔**

(۳) مسند احمد‘ کتاب باقی مسند الانصار‘ راوی : ابوامامہ ؓ۔

(٤) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الادب‘ باب فی التشدید فی الکذب ۔

(٥) موطأ مالك‘ کتاب الجامع‘ باب ما جاء فی الصدق والکذب۔

(٦) سنن الترمذی‘ کتاب البر والصلة‘ باب ما جاء فی الصدق والکذب۔

(۷) صحیح البخاری‘کتاب الایمان‘ باب من سلم المسلمون من لسانه و یده۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان تفاضیل الایمان وأی اموره افضل۔

(۸) سنن الترمذی‘ابواب الاستئذان والادب‘ باب ما جاء فی کراھیة اشارة الید بالسلام۔

(۹) سنن ابی داوٗد‘ کتاب اللباس‘ باب فی لبس الشھرة۔ومسند احمد‘ح٤٨٦٨۔

(۱۰)سنن الترمذی‘ابواب البر والصلة‘باب ما جاء فی المراء ۔

(۱۱) سنن ابی داوٗد‘کتاب الادب‘باب ماجاء فی المزاح۔

(۱۲)بحوالہ:معارف الحدیث‘ج٦‘ص٣٦٥۔

کلامِ اقبال - قرآن کے ترازو میں (۳)

پروفیسر عبداللہ شاہین

اقبال کا تصوّرِ اِبلیس

متصوفانہ ادب میں ابلیس کے متعلق طرح طرح کے تصورات ملتے ہیں۔ کسی نے اس کو ملعون ہونے کی بجائے سب سے بڑا ''موحِّد'' (۱) قرار دیا ہے' جس نے حکمِ الٰہی کے باوجود ''غیر اللہ'' (آدم علیہ السلام) کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ کسی کے نزدیک شیطان حرکت و عمل کا مصدر ہے اور موجودات کا وجود حرارت سے ہے' یعنی ؏

زندگی ہے اِک خلش و اِک تڑپ و اِک سفر (اقبال)

دراصل فلاسفہ کے نزدیک ابلیس کا مسئلہ خیر و شر کا مسئلہ ہے اور ان کے بقول حیات و کائنات میں شر کے وجود سے کون انکار کر سکتا ہے؟ انسان کے لیے شر کی ماہیت کا سمجھنا اور اس کا مقام متعیّن کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ خیر کی ماہیت کو سمجھنا (۲) — کیونکہ خیر و شر باہمی تقابل ہی

(۱) اللہ تعالیٰ کے حکم سجدہ سے انحراف کرنے والے ''کافر و منکر'' کو ''موحِّد'' قرار دینے کی کیسی بودی و بھونڈی دلیل ہے۔ حالانکہ ابلیس تو خواہشِ نفس کی پیروی کر کے بدترین شرک کا مرتکب ہوا۔ بفحوائے عبارتِ قرآنی:

﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (الفرقان:۴۳)

''کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے (اللہ کو چھوڑ کر) اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لیا؟''

کسی نے خوب استفسار کیا تھا کہ انسان کا شیطان تو ''ابلیس'' ہے مگر ابلیس کا ''شیطان'' کون تھا؟ تو جواب یہ ہے کہ شیطان کا شیطان اس کا نفس تھا' جس نے اس میں اکڑ پیدا کر کے اسے اغوا کیا۔

(۲) اقبال کے نزدیک بھی زندگی نفی و اثبات دونوں پر مشتمل ہے۔ ارتقائے حیات میں ایک حالت کی نفی سے دوسری حالت کا اثبات ہوتا ہے۔ زندگی خیر و شر کی پیکار کا نام ہے۔ شر نفی اور انکار کے مترادف ہے اور یہی صفت ابلیس کے تصوّر میں متشخّص ہو گئی ہے۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم ◀◀

سے سمجھ میں آ سکتے ہیں (۱)۔ لہٰذا نفی کا عنصر بھی اثبات سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ پس اس سے گریز ناواجب بلکہ ناممکن ہے (۲)۔ اس تصور کے مطابق شر کو خیرِ مطلق کا منافی سمجھنا ''بے بصری'' کا نتیجہ ہے۔ مستحضر رہے کہ شعراء و ادباء جو کردار تخلیق کرتے ہیں وہ ان کا اپنا مافی الضمیر ہوتا ہے یا کم از کم وہ اس کے ہمنوا ضرور ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض صوفیاء' حکماء اور شعراء نے ابلیس کو ٹریجڈی (ڈرامہ اور نظم کی ایک صنف) کا زبردست کردار بنا دیا۔ ملٹن کی نظم ''Paradise Lost'' میں شیطان ایک زبردست کریکٹر ہے۔ یہاں تک کہ بعض نقادوں کی رائے میں ملٹن کا شیطان اس کے خدا کے مقابلے میں زیادہ قوی اور لبریز حیات معلوم ہوتا ہے۔ گوئٹے کے ڈراما ''فوسٹ'' کا محور بھی ابلیس ہی ہے۔ مگر ہمیں دیگر حکماء و مفکّرین سے کچھ لینا دینا نہیں۔ البتہ اقبال جسے ''ترجمان القرآن'' کہا جاتا ہے' اس کے نظریات کو آیاتِ قرآنی سے ضرور ہم آہنگ ہونا چاہیے۔

اقبال جو ملٹن اور گوئٹے سے بلند پایہ' روحانی بصیرت والا اور اُمتِ مسلمہ کا نمائندہ شاعر ہے' اس نے بھی ابلیس کی ماہیت کو اپنے کلام میں کئی جگہ بیان کیا ہے اور اس کے کردار کی تشکیل میں اپنی قوتِ خیال کو پورے زوروں سے استعمال کیا ہے۔ (یعنی اس کا خیالی پیکر تیار کیا ہے) چنانچہ اقبال کے تصورِ ابلیس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر نظریاتِ حیات' ابلیس (کے خیالی پیکر) نے بھی وہی پیش کیے ہیں جو اقبال کی تعلیم میں نمایاں ہیں۔ چنانچہ ''ابلیس'' اپنے جواز میں کچھ اس انداز کی باتیں کہتا ہے جو بظاہر حکیمانہ' ترقیٔ نفس انسانی کا سرچشمہ اور لازمۂ حیات ہیں۔ چنانچہ اقبال کی نظم ''تسخیرِ فطرت'' میں ابلیس سجدۂ آدمؑ سے انکار کی وجہ بڑے زور و شور سے

◀◀ ''اقبال کی نظموں میں ابلیس تعلّی' تفاخر اور تکبّر کے باوجود اپنی بابت ایسی صفات بیان کر گیا ہے جنہیں اقبال ارتقائے حیات کا لازمہ سمجھتا ہے۔ لہٰذا اس نے ''جاوید نامہ'' میں ابلیس کو اہم نمائندۂ حیات اور زندگی کے ڈرامے کے اہم کردار کی حیثیت سے پیش کیا ہے..... اور اپنے نظریۂ حیات کا مبلغ بنا دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے ہم نوا ہو گیا ہے۔

(۱) خیر و شر کے باہمی تقابل کے بعد نتیجتاً ہم ''خیر'' کی ''مدحت'' اور ''شر'' کی ''مذمت'' کرتے ہیں — یہ نہیں کہ شر (شیطان) کی بھی تحسین کرنے لگیں کہ اگر وہ نہ ہوتا تو خیر کو کون پہچانتا اور اس کی قدردانی کرتا۔

(۲) کس قدر متضاد ہے فلاسفہ کا موقف! ایک طرف تو یہ نکتہ وری کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ''شر'' کو پیدا ہی کیوں کیا ہے؟ اور دوسری طرف خیر کی پہچان کے لیے ''شر'' کو ناگزیر گردانتے ہیں۔

بیان کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو حرکت کا سرچشمہ بتاتا ہے۔ زندگی میں جو برکت ہے وہ حرکت کی وجہ سے ہے۔ اس لیے وہ زندگی کی برکتوں کو بھی اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے۔ وہ ذاتِ باری تعالیٰ کو کہتا ہے:

می تپد از سوزِ من خونِ رگِ کائنات
من بہ دو صرصرم، من بہ غو تندرم
رابطۂ سالمات ، ضابطۂ اُمّہات
سوزم و سازے دہم آتش مینا گرم
ساختۂ خویش را در شکنم ریز ریز
تا ز غبارِ کہن پیکرِ نو آورم
پیکرِ انجم ز تو ، گردشِ انجم ز من
جاں بجہاں اندرم زندگی مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی شور بجاں من دہم
تو بہ سکون رہ زنی ، من بہ تپش رہبرم
نوریٔ ناداں نیم سجدہ بآدم برم
او بہ نہاد است خاک، من بہ نژاد آذرم
آدمِ خاکی نہاد دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوشِ تو، پیر شود در برم

خدا کے سامنے اپنی مدح سرائی کرنے اور خود ہی اپنی صفات بیان کرنے کے بعد کہ سب ہنگامہ ہائے حیات، زندگی کی تمام ہماہمی اور گہما گہمی میری وجہ سے ہے، میں نہ ہوتا تو نہ کائنات میں جنبش نظر آتی اور نہ زندگی میں سوز و ساز ہوتا — اب وہ اغوائے آدمؑ کو تسلیم کرنے کے بجائے یہ نکتہ وری اور تاویل کرتا ہے:

شعلہ ہا از کشتِ زارِ من دمید
او ز مجبوری بہ مختاری رسید
زشتیٔ خود را نمودم آشکار
ہا تو دادم ذوقِ ترک و اختیار

یعنی میرا وجود بلاوجہ اور غیر منفعت بخش تو نہیں ہے [1] زندگی کا قیام و ارتقاء نفی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ میں آتشِ حیات ہوں، میں نے آدمؑ کو بھڑکا کر مجبوری سے مختاری تک پہنچا دیا۔ میں نے اختیار برت کر انکار کیا اور آدمؑ نے بھی میری تلقین سے نافرمانی کا ایک قدم اٹھایا، اس کو لغزش مت کہو، اس نافرمانی نے اس کے اختیار کا ثبوت مہیا کیا۔ فرشتوں کی بے چون و چرا اطاعت اور جبر میں کیا فرق ہے؟ وہاں اختیار کا نام و نشان نہیں۔ اختیار تو لغزشِ آدمؑ سے پیدا ہوا، جو اس کے طویل ارتقاء کا لازمہ تھا۔ گویا بقول صاحبِ ''فکرِ اقبال'' ابلیس علامہ اقبال ہی کے نظریۂ ارتقائے آدم کو یوں بیان کرتا ہے: ؎

(۱) فلاسفہ، حکماء، شعراء اور ادباء کا ابلیس ایک اختراعی، افسانوی، طلسماتی، دیومالائی (legend) اور خوابناک کردار ہے جو زیب داستان کا پیکر ہے، جبکہ قرآنی ابلیس ایک واقعی، سلبی اور منفی کردار ہے۔ قرآن حکیم نے ابلیس کے انکار کی وجہ اس کا ''استکبار'' بتایا ہے، جبکہ فلاسفہ و مفکّرین کے نزدیک اس کا انکار اس کی جرأتِ رندانہ اور حریت و حرکت ہے، جس نے آدمؑ کو بھی لازمۂ حیات سکھایا ہے۔ انہوں نے منکر و مشرک کو موحّد بنا کر پیش کیا ہے جس نے معبودِ حقیقی کے حکم سے سرتابی کر کے ﴿مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ جیسا بدترین شرک کیا۔ یہ تو ''جنون'' کو ''خرد'' قرار دینا، ''ابوجہل'' کو ''ابوالحکم'' گردانا اور ''مجرم'' کو ''محرم'' کہنا ہے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کو بہکانے پھسلانے کو سلیقۂ حیات اور ارتقائے حیات کے گر اور ڈھنگ بتلانا۔ اقبال کے پیکر ابلیس کی یہ موشگافی، نکتہ وری اور دقیقہ سازی ایسے ہی ہے جیسے رشید احمد صدیقی کے کردار ''مچھر'' جیسے موذی جانور کی فلسفیانہ تاویلات۔ یعنی جب وہ شب خون مارتا ہے اور رات کے وقت انسان کو ستاتا اور اس کی نیند کے درپے ہوتا ہے تو اپنے آپ کو صوفیٔ بے ضرر ثابت کرتا ہے اور اپنی مردم آزاری کی یہ تاویل کرتا ہے کہ میں حضرت انسان کو دق تو نہیں کرتا بلکہ شب بیداری میں مدد و معاون ہوتا ہوں کہ بھلے آدمی غفلت کی نیند سونے کے بجائے اٹھو اور عبادتِ رب پر کمر بستہ ہو جاؤ! اور جب شب زندہ داروں کے پاؤں پر ڈنگ مار کر ان کی عبادت اور خشوع و خضوع میں مخل ہوتا ہے تو اپنی شرارت و شرانگیزی کو اپنے زہد و تقویٰ کے تقدس کی روئی میں لپیٹ کر یوں دعویٰ کناں ہوتا ہے کہ میں تو ان مقدس ہستیوں کی عظمت و بزرگی کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی قدم بوسی کرتا ہوں۔ غرضیکہ شیطان کے عُجب و استکبار کو توحیدِ خالص سے موَوّل کرنا اور اس کی ستیزہ کاریوں کو حرکت و برکت گرداننا بدترین تاویل اور بودی دلیل سازی و حجت بازی ہے۔

زندگیٔ سوز و ساز بہ ز سکونِ دوام
فاختہ شاہیں شود از تپشِ زیر دام
ہیچ نیابد ز تو غیرِ سجودِ نیاز
خیز چوں سروِ بلند اے بعمل نرم گام
کوثر و تسنیم برد از تو نشاطِ عمل
گیر زمینائے تاک بادۂ آئینہ فام
خیز کہ بنمائمت مملکتِ تازۂ
چشمِ جہاں بیں کشا بہرِ تماشا خرام!

یعنی تیری اس جنت میں کیا مزہ ہے؟ ایک مسلسل سکون ونشاط وسرور کی یک آہنگی۔ نہ ضرورتِ عمل' نہ نشاطِ کار' نہ مقصد کوشی! ایسی جنت میں تیرا ساز بے سوز ہے۔ سجودِ نیاز میں عجز کے سوا کیا رکھا ہے! کوثر وتسنیم کے کنارے شرابِ طہور پیتے رہنا' یہ بھی کوئی زندگی ہے! جنت اگر تمام آرزوؤں کے حصول کا نام ہے تو ایسی زندگی موت کے برابر ہے۔ اقبالی ابلیس کی یہ فلسفیانہ گفتگو' وہی بات ہے جو اقبال نے دوسری جگہ یوں کہی ہے:

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا[1]
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی!

(۱) اسی قماش کے چند دیگر اشعار بھی ہیں۔ جیسے:

(i) چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

یہ شاعرانہ شوخی' تعلّی یا بڑ اور لن ترانی تو ہوسکتی ہے' امر واقعہ نہیں' کیونکہ میدانِ حشر اور عالمِ آخرت میں تو یہ حال ہوگا کہ ﴿لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا﴾ ''کسی کو اس سے بات کرنے کا یارانہ ہوگا''۔ اور ﴿لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ﴾ (النبأ) ''رحمٰن کی اجازت کے بغیر کوئی بول بھی نہ سکے گا''۔ وہاں تو انبیاء ورسل اور مقربین فرشتوں کو بھی دم مارنے کی مجال نہ ہوگی' اقبال تو پھر بھی اُمتی ہے۔

(ii) فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک' یا دامنِ یزداں چاک!

یہ کیسا جنون (عشق یا جُہدِ مسلسل وسعی پیہم) ہے' جو شاعر کو دار الجزا (آخرت) میں

لیکن مذکورہ بالا تمام باتیں قرآنی مضامین سے کس قدر متصادم ہیں' کیونکہ جنّت میں تو اللہ تعالیٰ بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ اس کا رُواں رُواں (رونگٹا) اور بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہے۔ وہ مملوک وغلام (slave) ہونے کے باوجود آقا ومالک کی مرضی کے خلاف دار الانعام میں بھی اپنی جولانی دکھانے پر تلا ہوا ہے اور اس قدر تیز وطرار (over-efficient) بنتا ہے کہ اس سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ یہاں تک کہ ہماری بلی ہمیں کو میاؤں کے مصداق آقا کے گلے پڑنے (دامنِ یزداں چاک کرنے) سے بھی عار محسوس نہیں کرتا!

(iii) ترے شیشے میں مے باقی نہیں!
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
''بخیلی'' ہے یہ رزّاقی نہیں ہے!

کہنا اللہ تعالیٰ کی جناب میں بہت بڑی گستاخی ہے' جبکہ اللہ سبحانہ کی شان ''بخیلی'' جیسے رذائل سے پاک' مبراء اور وراء الوراء ہے۔ یہ تو فیض جیسے سوشلسٹ شاعر کی دریدہ دہنی کے مصداق ہے کہ ؎

اِک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے!

کیا اقبال جیسے ''ترجمان القرآن'' کی نظر سے سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۴:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ﴾

''اور یہود کہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) باندھ دیے گئے ان کے ہاتھ' اور ان پر لعنت کی گئی اس وجہ سے جو انہوں نے کہا۔ بلکہ اس (اللہ) کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔''

اور سورۂ آل عمران کی آیت:

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾﴾

''بے شک اللہ نے ان کی بات سن لی جن لوگوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں۔ اب ہم لکھ رکھیں گے جو انہوں نے کہا اور کہیں گے (قیامت کے دن) چکھو آتشِ سوزاں کے عذاب کا مزہ۔''

نہ گزری ہوں گی جو انتہائی وعید پر مبنی ہیں؟

نے آدم وحوا علیہما السلام کو بمحوائے عبارتِ قرآنی ﴿اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝۱۱۸ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝۱۱۹﴾ (طٰہٰ) ''زندگی کی بنیادی ضرورت خوراک' پوشاک اور رہائش (بالفاظِ دیگر روٹی' کپڑا اور مکان) فراہم کر کے ہر قسم کی صعوبت سے بے نیاز کر دیا تھا۔ مگر جنت سے نکلنے کے بعد بقولہٖ تعالیٰ ''فَتَشْقٰى'' آدمؑ مشقت میں پڑ گئے۔ اگر جنت سے نکلنا ان کا انحطاط اور ہبوط نہیں بلکہ عروج اور ارتقاء تھا تو اقبال نے خود ''زوالِ آدمِ خاکی'' کی ترکیب کیوں استعمال کی؟ اس سے تو خود اس کے اپنے موقف میں تضاد آ گیا۔ دراصل اقبالی ابلیس کی یہ چکنی چپڑی باتیں اس کی مکّاری ہے۔ کیونکہ از روئے قرآن وہ ایک دغاباز کردار ہے۔ بحوالہ عبارتِ قرآنی:

﴿كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ.....﴾ (الحشر:۱۶)

''مثال شیطان کی ہے کہ جب اس نے انسان سے کہا اپنے رب کی نعمتوں کی ناشکری کر۔ پھر جب اس نے ان نعمتوں کی ناقدری کی تو کہنے لگا کہ میں یقیناً تم سے بیزار اور بری ہوں.....''

چنانچہ مذکورہ بالا اشعار میں جب وہ آدمؑ سے کہتا ہے کہ اٹھ یہاں جنّت سے نکل (۱) تجھے ایک ایسے عالم کی سیر کراتا ہوں جہاں زندگی سوختنِ ناتمام ہے' سکونی جنت میں تو جمادی اور نباتی کیفیت ہے' تو دراصل وہ ''برگساں'' جیسے فلسفی کے مماثل نظریات کا اظہار کر رہا ہوتا ہے' جس کے مطابق نوعِ انسان' حیات کی ایک خاص منزل میں تھی جس سے اس کا نکلنا مزید ''ترقی'' اور ارتقاء کے لیے لازمی تھا۔ تکریمِ آدمؑ پہلی جنت سے نکلنے کے بعد ہی ظہور میں آئی۔ شیطان کے بہکانے اور آدم کے دنیا میں بھیجے جانے سے کچھ فائدہ ہی ہوا' اپنے آپ کو اور کائنات کو مسخر کرنے کا ایک شغل ہاتھ آ گیا۔ یوں ہبوطِ آدم کے تصور کو عروجِ آدم کا نظریہ بنا

(۱) یہ شیطان کی مکّاری اور چالبازی ہے۔ وہ ایک ایسا بگلا بھگت ہے جو بظاہر ایک ٹانگ پر چلہ کش ہوتا ہے' مگر جوں ہی شکار پہنچ میں آتا ہے ایک ہی وار میں اسے ہڑپ کر جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا مگرمچھ ہے جو دیکھنے میں مسکین اور آبدیدہ نظر آتا ہے' مگر جیسے ہی انسان زد میں آتا ہے' اپنے خوفناک جبڑے کھول کر اسے سالم نگل جاتا ہے (اسی سے تو مگرمچھ کے آنسو مشہور محاورہ وجود میں آیا)—— اللہ تعالیٰ نے بھی تو فرمایا ہے: ﴿وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۵﴾ (فاطر)۔

دیا گیا(۱) کہ آدم اس نئے عالم میں آ کر حسرت و حرماں کا شکار نہیں ہوا بلکہ اس تمام کشاکش کو آدمؑ نے اپنے پہلے سکون پر قابلِ ترجیح سمجھا اور پھر پہلی جنّت میں واپس (۲) جانے کی آرزو دل سے نکل گئی۔

اقبال کا بھی تو یہی خیال ہے کہ آدمؑ کا کمال اس کی سعیِ پیہم سے وابستہ ہے۔ پہلی جنّت بے کوشش یونہی بخشی ہوئی جنت تھی' جو آدمؑ (اور بنی آدمؑ) کے شایانِ شان نہیں۔ بقول اقبال ؎

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

مفت میں بخشی ہوئی جنت کے متعلق اقبال کا یہ بھی تو کہنا ہے ؎

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست
بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش
بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست!

حالانکہ جنت میں ازلی و ابدی اور اولاً و مابعداً اللہ کی عطا اور اس کی رحمت سے ہی داخلہ ہے' مگر ہم ''عطائی'' جنت لینے کے لیے آمادہ و تیار نہیں' جبکہ قرآن مجید جنت میں پہنچنے اور جہنم سے بچنے کے لیے ﴿فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ﴾ (الدخان:۵۷) اور ﴿اَلَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (فاطر:۳۵) ''کے الفاظ استعمال کرتا اور اسے اللہ کے فضل و کرم کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

(۱) ارتقاءِ حیات اور مزید ترقی کے لیے جنت سے نکلنا تو ضروری نہیں۔ البتہ اس سے مراد مغرب کی ترقی معکوس نہ ہو جو ''اسفل سافلین'' سے عبارت ہے کہ وہ لوگ دنیا کی زندگی پر ہی ریجھ کر رہ گئے ہیں اور کھانا' پینا' سونا' رفع حاجت اور شہوت رانی ہی ان کی کل کائنات بن کر رہ گئی ہے۔

(۲) حالانکہ انسان کی تمام تر تگ و دو اور نصب العین (goal) جنتِ گم گشتہ کو پا لینے میں ہے اور وہ جنتِ ازلی سے اتر کر بقولہ تعالیٰ ''فَتَشْقٰى'' یعنی مشقت میں پڑ گیا ہے۔ جبھی تو جنتِ دائمی سے رختِ سفر باندھ لینے کا حکم ملتے ہی آدم وحوا علیہما السلام (دونوں انسان) پشیمان و پریشان ہو گئے تھے اور ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا.....﴾ کے الفاظ سے دونوں نے معافی مانگی تھی۔ بمحوائے عبارتِ قرآنی ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝۳۶ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ﴾ (البقرۃ:۳۷) یعنی ''پس شیطان نے دونوں کو اُس درخت کے بارے میں پھسلا دیا اور ان کو اس جنت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے..... پھر آدمؑ (وحواؑ) نے اپنے ربّ سے کلماتِ (معافی) سیکھ لیے (اور توبہ کی) تو اللہ نے اس کی توبہ قبول فرمائی۔''

یہی بات سیدنا جابرؓ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يُدْخِلُ اَحَدًا مِّنْكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ وَلَا يُجِيْرُهُ مِنَ النَّارِ اِلَّا بِرَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ)) (۱)

''تم میں سے کسی کو بھی محض اُس کا عمل نہ تو جنت میں داخل کرے گا اور نہ ہی جہنم سے بچائے گا مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ۔''

دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاَبْشِرُوْا فَاِنَّهُ لَا يُدْخِلُ اَحَدًا الْجَنَّةَ عَمَلُهُ ...... وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِمَغْفِرَةٍ وَرَحْمَتِهِ)) (۲)

''راست گوئی وراست بازی اختیار کرو' عمل میں کوشش کرتے رہو اور بشارت حاصل کرتے رہو۔ اس لیے کہ محض کسی کا عمل اسے جنت میں داخل نہیں کرا سکے گا...... اور نہ ہی مجھے' سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی بخشش اور رحمت سے ڈھانپ لے۔''

غرضیکہ اسی ''کھوئی ہوئی جنت'' میں عود کر جانا ہے' جس کے دروازے اللہ کی رحمت سے کھلیں گے۔ البتہ اس میں درجات کا فرق وتفاوت اعمال کے مطابق ہے۔ (یعنی انبیاء' صِدِّیقین' شہداء' صالحین درجہ بدرجہ) —— لیکن بقول خلیفہ عبدالحکیم (۳):

''اقبال کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ قرآن نے آدمؑ کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ کسی ایک فرد کا ذکر نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی نفسیات اور اس کے ممکنات کا بیان ہے...... عارف رومی اور حکیم برگساں کے نظریات کے مماثل' ان کا خیال بھی تھا کہ نوعِ انسان ایک درجہ ارتقاء میں حیات کی ایک خاص منزل میں تھی' جس سے اس کا نکلنا مزید ترقی کے لیے لازمی تھا۔ متقیوں سے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ اس جنت کی طرف عود نہیں ہے جسے نوعِ انسانی بہت پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ آئندہ زندگی کی پیکار اور تسخیر سے جو جنت حاصل ہوگی وہ پہلی جنت سے افضل ہوگی...... ہر جنت ایک نئے انداز کا دار العمل ہوگی۔''(۴)

(۱) صحیح مسلم' کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار' باب لن یدخل احد الجنۃ بعملہ بل برحمۃ اللّٰہ تعالیٰ۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب القصد والمداومۃ علی العمل۔ وصحیح مسلم' کتاب صفۃ القیامۃ والجنۃ والنار' باب لن یدخل احدا الجنۃ بعملہ بل برحمۃ اللّٰہ تعالیٰ۔

(۳) ''فکرِ اقبال'' از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم' ص ۶۲۴' ۶۲۵۔

(۴) حالانکہ ''دار العمل'' تو دنیا ہے' جنت تو ''دار الجزاء'' ہے۔

چہ بوالعجبی است کہ آدمؑ کو جنت سے نکلوائے جانے کو ابلیس نے اس کی ترقی کا راز اور زینہ بتایا کہ دنیا میں اتارے جانے کے بعد ہی وہ انعام واکرام کا مستحق بنا۔ مگر نہلے پہ دہلا یہ ہے کہ اپنے مردود اور مطرود ہونے کی بھی بہت حسین تاویل کی ہے۔ یعنی یہ سوچا کہ حکم سجودِ آدمؑ کو ماننے سے انکار کر دے' خدا ایسا ناراض ہوگا کہ ہمیشہ کے لیے محبت کے راستے مسدود ہو جائیں گے۔ زہاد وصوفیا تو عاقبت کی خاطر دنیا کو چھوڑتے ہیں بلکہ اگلا مرحلہ یہ کہ ''وصلِ مولیٰ'' کے لیے ع

دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے!

یعنی ؎

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور وخیام سے گزر' بادہ و جام سے گزر!

پر تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر ابلیس کے ترک وایثار کے کمال دعویٰ کو دیکھئے کہ ''ترکِ جمالِ لایزال'' پر کمر بستہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: کسے معلوم کہ مردود ہونے میں مجھ کو کیا مزا آیا۔ میں کائنات کا سوزِ دروں بن گیا ہوں۔ زندگی میں ''فراق'' کی بنا میرے انکار نے ڈالی ہے۔ اسی وجہ سے کائنات کا ہر ذرّہ طلبِ وصال میں ارتقا کوش ہوا۔ گویا وہ خدا کے ساتھ بھی وصالِ کامل کا خواہش مند نہیں' جو عام طور پر صوفیاء کا مقصود ہے' کیونکہ وہ تو ترکِ دنیا اور ترکِ عقبیٰ' وصلِ مولیٰ کے لیے کرتے ہیں' ان کا مقصود ومطلوب تو وصالِ مولیٰ ہے جو انہیں سب سے زیادہ محبوب ومرغوب ہے۔ وہ تو جنت بھی اسی لیے چاہتے ہیں کہ ''رویتِ الٰہی'' نصیب ہو' مگر ابلیس جب اس کیفیت کا اظہار کرتا ہے کہ ؎

فطرتش بیگانۂ ذوقِ وصال
زُہدِ او ترکِ جمالِ لا یزال (جاوید نامہ)

تو اصل میں وہ اقبال کے اس فلسفہ کو پیش کرتا ہے ؎

عالمِ سوز وساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو' ہجر میں لذتِ طلب

گویا ''شوق بمیرد ز وصل'' اقبال کا پختہ عقیدہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اصول عشقِ مجازی میں چلتا ہو' لیکن واقعاتی شہادت (circumstantial evidence) اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ ؎

گُلوں میں رنگ بھرے' بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے!

کے تحت ''وارداتِ گُل وبلبل'' میں بھی ''وصل میں مرگِ آرزو'' کی منطق نہیں چلتی' بلکہ ؎

ایک تھا گُل اور ایک تھی بلبل
دونوں چمن میں رہتے تھے

سے ہی گلشن کا کاروبار چلتا ہے۔ چنانچہ پریت کی ریت بھی یہ ہے کہ ؎

جو کسی کے قریب ہوتے ہیں
وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

نیز ؎

ابھی تو آئے ہو جانے کا ذکر جانے دو!

اور ؎

گھونگھٹ کی اوٹ سے دلبر کا دیدار ادھورا رہتا ہے
جب تک نہ ملے نظروں سے نظر اقرار ادھورا رہتا ہے

پر اصرار ہوتا ہے — اور اگر زمانی ومکانی وجسمانی بُعد بھی ہو تو کم از کم ع

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اور ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کے بغیر گزارہ نہیں۔ اقبال خود بھی دوسری جگہ کہتا ہے: ؎

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

لہٰذا قرآن کا اصول تو ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ ہے۔ صوفیاء وزہاد کے ہاں بھی ع

تیری دید ہووے میری عید ہووے

اور ؎

تینوں تکدا ناں رجّاں
ہوون سو لکھ نیناں
اک کھولاں اک کجّاں

کی سی سرشاری مطلوب ہے۔

یہ عاشقِ خدا ہونے کا کیا اصولِ معیار (criteria) ہے کہ ابلیس اللہ کا ''حبیب'' اور ''نقیب'' بننے کی بجائے ''حریف'' اور ''رقیب'' بننا چاہتا ہے۔ حالانکہ ''شمع'' اور ''پروانہ'' ہی جانِ جاناں ہوتے ہیں ، ''بھنورے'' کو کوئی مقام ومرتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ ''جاوید نامہ'' میں ابلیس کے متعلق جو دو نظمیں بعنوان ''نمودار شدن خواجۂ اہلِ فراق ابلیس'' اور ''نالۂ ابلیس'' ہیں' دونوں نظموں میں کہیں ابلیس کی تحقیر نظر نہیں آتی' بلکہ مقطع میں ع

اے خنک جانے کہ گردد درد مند!

''کیا ہی کہنے ہیں اس جان کے مبارک ہونے میں جس میں درد ہے۔''

کہہ کر نہ صرف ابلیس کے زاویۂ نگاہ سے ہم نگاہی اور ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے بلکہ ''خواجۂ اہلِ فراق'' کے لقب سے نواز کر ستائش کی گئی ہے' جو کوئی طنزی یا تحقیری لقب نہیں ہے۔ (جاری ہے)

بقیہ: رزقِ حلال کی اہمیت

میں بھی بددیانتی کی جاسکتی ہے' لہٰذا اپنی اولاد کو روزگار پر لگنے کے بعد اس بات کی تلقین ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ حرام خوری سے دور رہا جائے' تھوڑی روزی ملتی ہو تو اس پر اکتفا کیا جائے اور بری روزی کما کر اپنی عاقبت کو خراب کرنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ اگر والدین اپنی اولاد کو جان بوجھ کر ایسا پیشہ اختیار کرواتے ہیں جس میں حرام روزی یا رشوت سے پیسہ آتا ہے تو اس سے بڑی عاقبت نااندیشی بلکہ حماقت کوئی نہیں' کیونکہ اولاد حرام کمائے گی تو نہ صرف اولاد کی آخرت برباد ہوگی' بلکہ حرام کمانے کے کام پر لگانے کے جرم میں والدین بھی ماخوذ ہوں گے۔

حواشی

(۱) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب من لم یبال من حیث کسب المال۔
(۲) مسند احمد' کتاب مسند المکثرین من الصحابۃ' ح ۳۴۹۰۔ راوی: عبداللہ بن جابرؓ۔
(۳) صحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب قبول الصدقۃ من الکسب لاطیب وتربیتھا۔
(٤) مسند احمد' کتاب باقی مسند المکثرین' باب مسند جابر بن عبداللہ ؓ۔ وسنن الدارمی' کتاب الرقاق' باب فی اکل السحت۔
(٥) رواہ احمد فی المسند' والبیھقی فی شعب الایمان۔
(٦) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب الحلال بین والحرام بین وبینھما مشتبھات۔ وصحیح مسلم' کتاب المساقاۃ' باب اخذ الحلال وترک الشبھات۔ واللفظ لہ۔ ❁❁

مولانا وحیدالدین خان

اپنے الفاظ کے آئینے میں (۲)

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

سابقہ قسط میں ہم نے مولانا وحیدالدین خان صاحب کے تصورِ مہدی و مسیح پر ان ہی کے الفاظ کی روشنی میں مفصل بحث کی تھی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ خان صاحب کے نزدیک مہدی، عیسیٰ بن مریم، رجل مؤمن اور مجدد آخر الزمان ایک ہی شخصیت کے مختلف نام ہیں اور یہ شخصیت قیامت سے پہلے اخوانِ رسول کی ایک ٹیم (یعنی سی ایس پی) کے ساتھ، اُمتِ مسلمہ میں ایک مصلح کی حیثیت سے دعوت وامن کا کام عالمی سطح پر کرے گی۔ دجالی فتنے یعنی الحاد کا دلائل کے ساتھ نظریاتی قتل کرے گی۔ فتنہ دہیما یعنی تحریکی فکر کے سبب سے مسلمانوں میں پیدا ہونے والے نظریاتی کنفیوژن کو دور کرے گی۔ عصری یعنی سائنسی اسلوب میں اسلام کی تعلیمات پیش کرے گی اور اس میں تجزیاتی صلاحیت کمال درجہ میں ہوگی۔ انقلابی یا سیاسی لیڈر نہیں ہوگی بلکہ عارف باللہ ہوگی۔ وہ اپنے مجدد یا مہدی یا مسیح ہونے کا اعلان نہیں کرے گی، لہٰذا معاصر مسلمان اس کا انکار کریں گے۔ اس کے باوجود اس کو پہچان کر اس کی نصرت کرنا ہر مسلمان کا بنیادی فریضہ ہوگا۔ اس کے ساتھیوں کو اس کے مہدی یا مسیح ہونے کی نسبت سے اچھے خواب آئیں گے۔ اس کے مجدد یا مہدی یا مسیح ہونے کا یقینی علم آخرت میں حاصل ہوگا وغیر ذلک۔

بدعی تصورِ مہدی و مسیح کا علمی محاکمہ

اس قسط میں ہم خان صاحب کے اس تصورِ مہدی و مسیح کا احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں ایک تجزیہ پیش کریں گے اور ان باطنی تاویلات کا بھی علمی محاکمہ کریں گے جنہیں خان صاحب نے الفاظِ رسول ﷺ کا جامہ پہنانے کی آخری حد تک کوشش کی ہے۔

خان صاحب نے پہلے مہدی و مسیح کا ایک ایسا تصور قائم کیا جو ان کی شخصیت ہی کے گرد

گھومتا تھا تو بعد ازاں نے انہوں نے اس تصور کو احادیث رسول ﷺ کی باطنی تاویلات کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی، اور اس میں بھی ان کا سلوبِ تحقیق یہ ہے کہ مہدی و مسیح کے بارے صرف انہی روایات یا ان کے بعض حصوں کو اپنے استدلال کی بنیاد بنایا جن کی تاویلات کی وہ جرأت کر سکے، اور جن روایات یا ان کے بعض حصوں کی تاویلات ان کے لیے ممکن نہ ہوسکیں تو انہیں خان صاحب نے یکسر نظر انداز کر دیا۔ پس خان صاحب کا تصورِ مہدی و مسیح اس بارے میں اللہ کے رسول ﷺ سے مروی روایات کے ایک منتخب حصے سے ماخوذ ہے کہ جس میں احادیث کی ایک معتد بہ تعداد اور الفاظ کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

علمی انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ جب آپ نے اپنے تصورِ مہدی و مسیح کی نسبت اللہ کے رسول ﷺ کی طرف کرنی ہے تو پھر اللہ کے رسول ﷺ سے مہدی و مسیح کے بارے میں مروی جمیع روایات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی کوئی ایسی تشریح پیش کریں کہ جنہیں الفاظ قبول بھی کرتے ہوں۔ پس خان صاحب کے تصورِ مہدی و مسیح میں دو بنیادی خامیاں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی بنیاد مہدی و مسیح کے بارے میں مروی روایات کا ایک جزو ہے نہ کہ کُل روایات، اور دوسرا اس جزو کی بھی ایسی تاویلات کی گئی ہیں کہ اس کے الفاظ ان تاویلات کو قبول کرنے سے معذور ہیں۔

۱۔ خان صاحب کا دعویٰ یہ تھا کہ مہدی اور عیسیٰ بن مریم ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ خان صاحب کا یہ دعویٰ فرامینِ رسول ﷺ کے خلاف ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((فَيَنْزِلُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ عليه السلام، فَيَقُوْلُ اَمِيْرُهُمْ [اَلْمَهْدِيُّ] تَعَالَ صَلِّ لَنَا، فَيَقُوْلُ: لَا، اِنَّ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ اُمَرَاءُ، تَكْرِمَةَ اللّٰهِ هٰذِهِ الْاُمَّةَ)) (صحيح مسلم، كتاب الايمان۔ ومسند احمد : ۳۸۴/۳، مؤسسة قرطبة، القاهرة)

''پس عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نازل ہوں گے تو مسلمانوں کے امیر مہدی فرمائیں گے: آیئے! ہمیں نماز پڑھائیں، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے: نہیں (یعنی آپ ہی نماز پڑھائیں، کیونکہ) تم میں سے بعض، بعض کے امیر ہیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسا اس امت کی عزت افزائی کے لیے فرمائیں گے۔''

امام ابن قیم اور علامہ البانی رحمہما اللہ نے اس روایت کی سند کو 'جید' قرار دیا ہے۔ (المنار المنيف فى الصحيح والضعيف : ص ۱۱۴؛ السلسلة الصحيحة : ۲۲۳۶)

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

((مِنَّا الَّذِيْ يُصَلِّي عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ خَلْفَهُ)) (كنز العمال : ۲۶۶/۱۴،

مؤسسة الرسالة)

''وہ ہم میں سے ہوگا جس کے پیچھے عیسیٰ بن مریم نماز ادا کریں گے۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ (السلسلة الصحيحة : ٢٢٩٣)

پس فرمانِ رسول ﷺ کے مطابق مہدی امام اور عیسیٰ علیہ السلام مقتدی ہوں گے اور ایسا اُمتِ مسلمہ کو شرف بخشنے کے لیے ہوگا تو دونوں ایک ہی شخصیت کیسے ہو گئے؟ **فيا للعجب!**

اسی طرح بیسیوں روایات میں مسیح کا نام عیسیٰ بن مریم علیہ السلام منقول ہے جبکہ مہدی کا نام محمد بن عبداللہ نقل ہوا ہے۔ پس دونوں ایک ہی شخصیت کیسے ہو سکتے ہیں؟ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((يُوَاطِئُ اسْمُهُ اسْمِي وَاسْمُ اَبِيْهِ اسْمُ اَبِيْ)) (سنن أبي داوٗد' كتاب المهدى)

''مہدی کا نام میرے نام پر ہوگا اور اس کے والد کا نام میرے والد کے نام پر ہوگا۔''

شیخ احمد شاکر اور علامہ البانی رحمہما اللہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ (مسند احمد :١٣٩/٦؛ صحيح أبي داوٗد : ٤٢٨٢)

٢۔ خان صاحب کا کہنا یہ بھی ہے کہ مہدی یا مسیح عام انسانوں جیسا ایک مصلح ہوگا۔ ان کا یہ دعویٰ بھی فرامین رسول ﷺ کے صریحاً خلاف ہے۔ جہاں تک مسیح کا معاملہ ہے تو اس بارے میں قطعی الدلالت نصوص موجود ہیں کہ نازل ہونے والے مسیح' عیسیٰ ﷺ اللہ کے نبی ہوں گے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((اَلْاَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ' أُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ' وَأَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ لِاَنَّهُ لَمْ يَكُنْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُ نَبِيٌّ' وَإِنَّهُ نَازِلٌ فَإِذَا رَأَيْتُمُوْهُ فَاعْرِفُوْهُ رَجُلًا مَرْبُوْعًا إِلَى الْحُمْرَةِ وَالْبَيَاضِ عَلَيْهِ ثَوْبَانِ مُمَصَّرَانِ' كَأَنَّ رَأْسَهُ يَقْطُرُ وَإِنْ لَمْ يُصِبْهُ بَلَلٌ)) (مسند احمد : ٤٠٦/٢' مؤسسة قرطبة' القاهرة)

''انبیاء آپس میں علاتی (یعنی باپ شریک) بھائی ہیں' ان کی مائیں (یعنی شریعتیں) جدا ہیں جبکہ دین ایک ہے۔ اور میں (محمد ﷺ)' عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے سب سے زیادہ قریب ہوں' کیونکہ میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے' اور بے شک وہ نازل ہونے والے ہیں۔ پس جب تم ان کو دیکھو تو ان کو پہچاننے کی کوشش کرو کہ وہ ایک ایسے شخص ہیں جو سرخ و سفید رنگ میں درمیانے قد کے ہوں گے اور ان پر دو ہلکے زرد رنگ

کے کپڑے ہوں گے۔ گویا ان کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں اگرچہ انہیں پانی نہ پہنچا ہو۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ (السلسلة الصحيحة : ٢١٨٢)

جبکہ مہدی کے بارے میں مستند روایات کے مطابق ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہلِ بیت سے ہوگا' ایک رات میں اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح فرمائیں گے' ملک عرب کا بادشاہ ہوگا' زمین کو عدل وقسط سے بھر دے گا' عیسیٰ علیہ السلام اس کی اقتدا میں نماز ادا کریں گے وغیر ذلک۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((اَلْمَهْدِيُّ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ يُصْلِحُهُ اللّٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ)) (سنن ابن ماجه' كتاب الفتن۔ ومسند احمد : ٨٤/١' مؤسسة قرطبة' القاهرة)

''مہدی ہم اہلِ بیت کے خاندان سے ہوگا اور اللہ تعالیٰ ایک رات میں اس کی اصلاح فرمائیں گے۔''

اس روایت کو شیخ احمد شاکر اور علامہ البانی رحمہما اللہ نے صحیح کہا ہے۔ (مسند احمد : ٥٨/٢؛ السلسلة الصحيحة : ٢٣٧١)

٣۔ خان صاحب کا کہنا یہ بھی ہے کہ مہدی یا مسیح انقلابی یا سیاسی لیڈر نہیں ہوگا بلکہ عارف باللہ ہوگا۔ خان صاحب کا یہ نقطہ نظر بھی مستند روایات کے خلاف ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((لَا تَذْهَبُ أَوْ لَا تَنْقَضِي الدُّنْيَا حَتّٰى يَمْلِكَ الْعَرَبَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ بَيْتِيْ يُوَاطِئُ اسْمُهُ اسْمِيْ)) (سنن أبي داوٗد' كتاب المهدى)

''دُنیا ختم نہیں ہوگی یہاں تک کہ ملک عرب کا حکمران ایک ایسا شخص بنے کہ جو میرے اہلِ بیت میں سے ہو اور اس کا نام میرے نام پر ہو۔''

امام ابن تیمیہ' شیخ احمد شاکر اور علامہ البانی رحمہم اللہ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ (منهاج السنة :٢٥٥/٨؛ مسند احمد : ٧٤/٦؛ صحيح أبي داوٗد : ٤٢٨٢)

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

((يَمْلَأُ الْاَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ جَوْرًا وَظُلْمًا يَمْلِكُ سَبْعَ سِنِيْنَ)) (سنن أبي داوٗد' كتاب المهدى)

''مہدی زمین کو عدل وقسط سے بھر دے گا جیسا کہ وہ ظلم وجور سے بھر دی گئی تھی اور سات سال بادشاہ رہے گا۔''

امام ابن تیمیہ اور علامہ البانی رحمہما اللہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔(منهاج السنة: ٨/٢٥٥؛ صحيح أبي داوٗد:٤٢٨٥)

روایت میں 'یملك سبع سنین' کے الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عدل وقسط سے مراد نظریاتی عدل نہیں ہے' جیسا کہ خان صاحب کی تاویل ہے' بلکہ اس سے مراد قضائی عدل ہے جو حکمرانی اور طاقت کا متقاضی ہے۔ پس مہدی ایک انقلابی حکمران ہوگا۔ اسی طرح مسیح کے بارے بھی مستند روایات میں منقول ہے کہ وہ ایک عادل حکمران ہوں گے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((لَيُوْشِكَنَّ أَنْ يَنْزِلَ فِيْكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا' فَيَكْسِرُ الصَّلِيْبَ' وَيَقْتُلَ الْخِنْزِيْرَ وَيَضَعَ الْجِزْيَةَ وَيَفِيْضَ الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهُ أَحَدٌ حَتّٰى تَكُوْنَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا)) ثُمَّ يَقُوْلُ اَبُوْهُرَيْرَةَ: وَاقْرَءُوْا إِنْ شِئْتُمْ ﴿وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا﴾)) (صحيح البخاری' كتاب أحاديث الأنبياء' باب نزول عيسى بن مريم)

''عنقریب تمہارے مابین عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ایک عادل حکمران کی صورت میں نازل ہوں گے۔ وہ صلیب کو توڑ دیں گے' خنزیر کو قتل کر دیں گے' جزیہ کا خاتمہ کر دیں گے۔ مال کو اس قدر تقسیم کریں گے کہ اسے کوئی قبول کرنے والا باقی نہ رہے گا۔ اور ایک سجدہ اُس وقت دنیا و مافیہا سے بہتر سمجھا جائے گا''۔ یہ روایت نقل کرنے کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اب تم چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو: ''اور اہلِ کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لائے اور وہ قیامت والے دن ان پر گواہ ہوں گے۔''

۴۔ خان صاحب کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ مہدی اور مسیح کا معاصر مسلمان انکار کریں گے۔ خان صاحب کا یہ کہنا بھی درست نہیں ہے' کیونکہ ایک ایسے عادل بادشاہ یا حکمران کا انکار کیسے ممکن ہے کہ جو زمین کو عدل وقسط سے بھر دے' جس کے ہاتھوں مال و دولت کی منصفانہ تقسیم سے کوئی حاجت مند باقی نہ رہے' اور اس قدر دینداری غالب آ جائے کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر سمجھا جائے' جیسا کہ مذکورہ بالا روایات سے واضح ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق مسلمان تو کجا اہلِ کتاب میں سے بھی کوئی ایسا باقی نہ رہے گا جو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پر ان کی وفات سے پہلے ایمان نہ لے آئے۔

۵۔ خان صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ مہدی و مسیح کے مہدی یا مسیح ہونے کا یقینی علم آخرت میں ہی حاصل ہوگا اور دنیا میں لوگوں کے لیے قطعی طور پر یہ معلوم کرنا ممکن نہیں ہے کہ مہدی و مسیح کون ہے؟ خان صاحب کا یہ دعویٰ بھی روایاتِ صحیحہ کے صریح خلاف ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((إِذْ بَعَثَ اللّٰهُ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ' فَيَنْزِلُ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَاءِ شَرْقِيَّ دِمَشْقَ' بَيْنَ مَهْرُوْدَتَيْنِ' وَاضِعًا كَفَّيْهِ عَلٰى اَجْنِحَةِ مَلَكَيْنِ' إِذَا طَأْطَأَ رَأْسَهٗ قَطَرَ' وَإِذَا رَفَعَهٗ تَحَدَّرَ مِنْهُ جُمَانٌ كَاللُّؤْلُؤِ)) (صحيح مسلم' كتاب الفتن وأشراط الساعة' باب ذكر الدجال وصفته وما معه)

''جب اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم کو مبعوث فرمائیں گے تو وہ دمشق کے مشرقی جانب سفید منارہ پر دو فرشتوں کے پروں پر اپنی ہتھیلیاں رکھے ہوئے نازل ہوں گے اور ورس وزعفران سے رنگے ہوئے دو کپڑوں میں ملبوس ہوں گے۔ وہ جب اپنے سر کو نیچے اوپر کریں گے تو اس سے موتیوں کی مانند پانی کے قطرے گریں گے۔''

حضرت عیسیٰ بن مریم کا فرشتوں کے پَروں پر ہاتھ رکھے دمشق کے مشرق میں سفید منارہ پر اترنا' اس حال میں کہ ان کے کپڑوں کا رنگ اور ان کی صفات بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کر دی ہیں' تو اس کے بعد بھی کیا ان کے مسیح ہونے میں کوئی شک باقی رہ جائے گا؟

خان صاحب نے اس روایت کے الفاظ 'المنارة البيضاء' کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد age of aviation ہے اور سفید منارہ سے مراد ایئر پورٹ کا سفید ٹاور ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ حدیث میں صرف سفید منارہ کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ **المنارة البيضاء شرقي دمشق** (دمشق کے مشرق میں سفید منارہ) کے الفاظ ہیں اور دمشق یا دمشق کے مشرقی حصہ میں موجود سفید منارہ کا age of aviation سے کیا تعلق بنتا ہے؟ معاصر age of aviation میں دمشق یا اس کے مشرقی حصہ کا کیا کردار رہا ہے؟ علاوہ ازیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سر سے موتیوں کی مانند پانی کے قطرے گرنے کا age of aviation سے کیا تعلق بنتا ہے؟ درحقیقت خان صاحب نے اپنی اس تاویل کے ذریعے حضرت عیسیٰ بن مریم کے معجزانہ نزول' جو ان کی پہچان کی مبرہن دلیل تھی' کو مسخ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

((فَيَمْكُثُ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً ثُمَّ يُتَوَفّٰى وَيُصَلِّيْ عَلَيْهِ الْمُسْلِمُوْنَ)) (مسند احمد: ٢/٤٠٦' مؤسسة قرطبة' القاهرة)

''پس حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام چالیس سال زندہ رہیں گے اور پھر فوت کر دیے جائیں گے اور مسلمان ان کی نماز جنازہ ادا کریں گے۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔(السلسلة الصحيحة : ٢١٨٢)

سوال یہ ہے کہ اگر مہدی و مسیح کی یقینی پہچان دنیا میں ممکن نہیں ہے تو اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی تفصیلی صفات اور احوالِ نزول اس قدر تفصیل سے متعدد فرامین میں کیوں بیان کیے ہیں؟

آمدِ دجّال

مہدی و مسیح کی طرح دجال کے بارے بھی خان صاحب کا نقطہ نظر بہت ہی عجیب ہے۔ ان کے نزدیک دجال سے مراد دھوکے باز ہے جو ذہنی و فکری گمراہی پیدا کرے گا نہ کہ انوکھی صفات کا حامل شخص جو قتل و غارت گری کرے گا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''دجال کے لفظی معنی بہت دھوکا دینے والا ہے۔ دجال اپنا یہ کام تلوار کے ذریعے نہیں کرے گا۔ دھوکا دینا' دلیل کے ذریعے ہوتا ہے' نہ کہ تلوار کے ذریعے۔ چنانچہ دجال علم اور دلائل کے زور پر لوگوں کو بہکائے گا۔ وہ لوگوں کو ذہنی گمراہی میں مبتلا کرے گا۔ دجال کے مقابلے میں جو شخص اس کی کاٹ کے لیے اٹھے گا' اس کے لیے صحیح مسلم میں 'حجیج' کا لفظ آیا ہے۔ لسان العرب میں 'حجیج' کا مفہوم ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: **محاجة ومغالبة باظهار الحجة عليه** (٢/٢٢٨) یعنی دلائل کے ذریعے غالب آنے والا ...حدیث میں آتا ہے کہ دجال کی پیشانی پر ک،ف،ر (کفر) لکھا ہوا ہوگا (صحیح مسلم' کتاب الفتن)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دجال جس دور میں پیدا ہوگا' وہ خدا سے کفر (انکار) کا دور گا' یعنی الحاد کا دور۔'' (ماہنامہ الرسالہ: مئی ٢٠١٠ء' ص ١٨)

خان صاحب کے بقول' لوگ دجال کی آمد کے منتظر ہیں حالانکہ وہ آ چکا ہے اور اب اس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ اس کے انتظار کی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''دجال کے بارے میں حدیث کی کتابوں میں بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ ان روایتوں میں دجال کی انوکھی صفات بتائی گئی ہیں۔ لوگ ان صفات کو لفظی معنی میں لے لیتے ہیں۔ اس لیے ابھی تک وہ دجال کی شخصی آمد کے منتظر ہیں' حالاں کہ اس معاملے میں اب انتظار کا وقت نہیں' بلکہ دجال کے مقابلے میں اپنا کردار ادا کرنے کا وقت ہے۔''

(ماہنامہ الرسالہ: مئی ٢٠١٠ء' ص ٢٥)

احادیث رسول ﷺ اس بارے میں صریح ہیں کہ دجال کا کام ذہنی و فکری کنفیوژن پیدا کرنا

نہیں بلکہ اپنی انوکھی صفات کے ساتھ ربوبیت کا دعویٰ کرنا اور قتل و غارت گری برپا کرتے ہوئے اہل ایمان کو آزمائش میں مبتلا کرنا ہے۔ ایک روایت میں دجال کے الفاظ یوں نقل ہوئے ہیں:

((وَإِنِّي أُوشِكُ أَنْ يُؤْذَنَ لِي فِي الْخُرُوجِ فَأَخْرُجَ فَأَسِيرَ فِي الْأَرْضِ فَلَا أَدَعَ قَرْيَةً إِلَّا هَبَطْتُهَا فِي أَرْبَعِينَ لَيْلَةً غَيْرَ مَكَّةَ وَطَيْبَةَ فَهُمَا مُحَرَّمَتَانِ عَلَيَّ كِلْتَاهُمَا كُلَّمَا أَرَدْتُ أَنْ أَدْخُلَ وَاحِدَةً أَوْ وَاحِدًا مِنْهُمَا اسْتَقْبَلَنِي مَلَكٌ بِيَدِهِ السَّيْفُ صَلْتًا يَصُدُّنِي عَنْهَا وَإِنَّ عَلَى كُلِّ نَقْبٍ مِنْهَا مَلَائِكَةً يَحْرُسُونَهَا))(صحيح مسلم' كتاب الفتن وأشراط الساعة' باب قصة الجساسة)

''قریب ہے کہ مجھے خروج کی اجازت مل جائے پس میں نکلوں گا اور زمین میں چلوں پھروں گا۔ پس چالیس راتوں میں' میں کسی بھی بستی سے نہیں گزروں گا لیکن اس کو نیست و نابود کر دوں گا سوائے مکہ اور مدینہ کے۔ پس ان دونوں بستیوں میں داخلہ مجھ پر حرام ہے۔ پس جب بھی میں مکہ اور مدینہ میں سے کسی بستی میں داخل ہونا چاہوں گا تو ایک فرشتہ میرے سامنے تلوار سونتے کھڑا ہوگا جو مجھے اس میں داخل ہونے سے روکے گا اور ان دونوں بستیوں میں داخلے کے ہر رستے پر کچھ فرشتے پہریدار مقرر ہوں گے۔''

اگر فتنہ دجال سے مراد اس کا نظریاتی فتنہ ہے تو مکہ اور مدینہ میں اس نظریہ کے داخل ہونے میں کیا ممانعت ہے؟ اور پھر اس نظریے کو مکہ و مدینہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے بھی کیا تلوار سونتے فرشتے مقرر کیے گئے ہیں؟

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ جب دجال کا خروج ہوگا اور ایک بندۂ مؤمن اس سے ملاقات کا قصد کرے گا تو اس کے چیلے اس کو روکیں گے اور سوال کریں گے:

((فَيَقُولُونَ لَهُ أَيْنَ تَعْمِدُ؟ فَيَقُولُ أَعْمِدُ إِلَى هٰذَا الَّذِي خَرَجَ، قَالَ فَيَقُولُونَ لَهُ أَوَ مَا تُؤْمِنُ بِرَبِّنَا؟ فَيَقُولُ مَا بِرَبِّنَا خَفَاءٌ، فَيَقُولُونَ اقْتُلُوهُ، فَيَقُولُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ أَلَيْسَ قَدْ نَهَاكُمْ رَبُّكُمْ أَنْ تَقْتُلُوا أَحَدًا دُونَهُ، قَالَ فَيَنْطَلِقُونَ بِهِ إِلَى الدَّجَّالِ)) (صحيح مسلم' كتاب الفتن وأشراط الساعة' باب في صفة الدجال وتحريم المدينة عليه)

''پس دجال کے چیلے اس بندۂ مؤمن سے کہیں گے کہ کہاں کا قصد ہے؟ وہ کہے گا کہ یہ جو نکلا ہے' اس کا ارادہ کیا ہے۔ پس وہ کہیں گے کیا تو ہمارے رب (دجال) پر ایمان رکھتا ہے؟ تو بندۂ مومن جواب دے گا: میرا رب مجھ پر مخفی نہیں ہے۔ تو وہ کہیں گے کہ

اسے قتل کر دو۔ تو ان میں سے ایک دوسرے سے کہے گا: کیا تمہارے رب (دجال) نے تمہیں منع نہیں کیا ہے کہ تم اس کی اجازت کے بغیر کسی کو قتل کرو۔ پس وہ اس شخص کو لے کر دجال کی طرف جائیں گے۔''

اس روایت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ دجال ربوبیت کا دعویدار شخص ہوگا۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

((إِنَّ مَسِيحَ الدَّجَّالِ رَجُلٌ، قَصِيرٌ، أَفْحَجُ، جَعْدٌ، أَعْوَرُ، مَطْمُوسُ الْعَيْنِ، لَيْسَ بِنَاتِئَةٍ وَلَا حَجْرَاءَ، فَإِنْ أُلْبِسَ عَلَيْكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّ رَبَّكُمْ لَيْسَ بِأَعْوَرَ)) (سنن أبی داوٗد، کتاب الملاحم، باب خروج الدجال)

''بلاشبہ مسیح دجال ایک چھوٹے قد کا شخص ہوگا۔ چوڑی ٹانگوں والا، گھونگھریالے بالوں والا، مٹی ہوئی آنکھ کے ساتھ کانا ہوگا جبکہ اس کی وہ آنکھ نہ تو ابھری ہوئی ہوگی اور نہ ہی گہری ہوگی۔ پس اگر تمہیں اس کے بارے میں شبہ ہو جائے تو جان لو کہ تمہارا رب کانا نہیں ہے۔''

اگر تو دجال کے پاس انوکھی صفات نہیں ہوں گی اور وہ ان کی بنا پر رب ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کرے گا تو اللہ کے رسول ﷺ نے یہ کیوں کہا کہ اگر تمہیں اس کے رب ہونے کے بارے شبہ ہو جائے تو جان لو کہ تمہارا رب کانا نہیں ہے؟

جہاں تک اس بات کا معاملہ ہے کہ دجال سے مقابلہ کرنے والے کے لیے 'حجیج' کا لفظ استعمال ہوا ہے تو اس بارے میں روایات واضح ہیں کہ جب دجال ربوبیت کا دعویٰ کرے گا تو اس کی ربوبیت کو چیلنج کرتے ہوئے اس سے مکالمہ کرے گا اور پھر اس بندۂ مؤمن کو تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے دجال دو ٹکڑے کر کے دوبارہ زندہ کرے گا' لیکن بندۂ مؤمن اس کے رب ہونے کا دوبارہ انکار کرے گا اور اب دجال کا اس پر بس نہیں چلے گا۔ تو بندۂ مؤمن اور دجال کے مابین یہ جو مکالمہ ہے' اس مکالمہ کے سبب سے 'حجیج' لفظ استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دجال کے ہاتھوں بندۂ مومن کی اس شہادت کو عظیم شہادت کا نام دیا ہے' لیکن خان صاحب نے اس طویل اور مفصل روایت کا بھی صرف آخری جزو پکڑتے ہوئے شہادت کے لفظ کو نظریاتی شہادت بنا دیا ہے۔ **واللہ المُستعان علٰی ما تصفون۔** (صحیح مسلم، کتاب الفتن و أشراط الساعة، باب فی صفة الدجال و تحریم المدینة علیه)

قتلِ دجّال

مولانا وحید الدین خان صاحب کے نزدیک مہدی اور مسیح کا سب سے بڑا کارنامہ

دجال کا قتل ہے' اور دجال کے قتل سے مراد دجالی فتنے کا استدلالی رد ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ مسیح کی آمد سے مراد مسیح کے رول کی آمد ہے' یعنی دور آخر میں جب کہ دجال ظاہر ہوگا' اس وقت اُمت محمدی کا کوئی شخص اٹھے گا اور مسیح جیسا رول ادا کرتے ہوئے دجال کے فتنوں کا مقابلہ کرے گا اور اس کو شکست دے گا۔ حدیث میں قتل دجال کا ذکر ہے۔ اس سے مراد دجال کا جسمانی قتل نہیں ہے' بلکہ دجال کے فتنے کو بذریعہ دلائل قتل کرنا ہے۔'' (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء' ص ۴۶)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''قتل دجال کے بارے میں ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں: فَإِذَا نَظَرَ إِلَيْهِ الدَّجَّالُ ذَابَ كَمَا يَذُوبُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ، وَيَنْطَلِقُ هَارِبًا، وَيَقُولُ عِيسَى عليه السلام إِنَّ لِي فِيكَ ضَرْبَةً لَنْ تَسْبِقَنِي بِهَا (کتاب الفتن، باب ذکر الدجال) یعنی دجال جب مسیح کو دیکھے گا' تو وہ اس طرح گھلنے لگے گا جیسے کہ نمک پانی میں گھلتا ہے' اور وہاں سے بھاگنا شروع کر دے گا۔ مسیح کہیں گے کہ میرے پاس تیرے لیے ایک ایسی ضرب ہے جس سے بچنا ہرگز تیرے لیے ممکن نہیں۔ اس روایت میں جو بات کہی گئی ہے' وہ تمثیل کی زبان میں ہے۔ اس پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دجال کے مقابلے میں جو واقعہ پیش آئے گا' وہ یہ ہے کہ مسیح اس کے دجل کا علمی تجزیہ کر کے اس کو ایکسپوز کر دیں گے۔ اس طرح وہ دلائل کے ذریعے دجال کو بے نقاب کر دیں گے۔'' (ماہنامہ الرسالہ: مئی ۲۰۱۰ء' ص ۵۳)

اللہ کے رسول ﷺ کی روایات اس بارے میں واضح ہیں کہ قتل دجال سے مراد کسی نظریہ کا استدلالی قتل نہیں بلکہ ایک شخص کا حقیقی قتل ہے جو رب ہونے کا دعویدار ہوگا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((يَخْرُجُ الدَّجَّالُ فِي أُمَّتِي فَيَمْكُثُ أَرْبَعِينَ لَا أَدْرِي أَرْبَعِينَ يَوْمًا أَوْ أَرْبَعِينَ شَهْرًا أَوْ أَرْبَعِينَ عَامًا فَيَبْعَثُ اللَّهُ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ كَأَنَّهُ عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُودٍ، فَيَطْلُبُهُ، فَيُهْلِكُهُ)) (صحیح مسلم، کتاب الفتن و أشراط الساعة' باب فی خروج الدجال و مکثه فی الارض و نزول عیسی و قتله ایاه)

''دجال کا خروج میری امت میں ہوگا اور وہ چالیس تک رہے گا۔ راوی کہتے ہیں کہ اب میرے علم میں یہ نہیں ہے کہ چالیس سے مراد چالیس دن ہیں یا چالیس ماہ یا چالیس سال۔ پس اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمائیں گے گویا وہ عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

ہیں۔پس وہ دجال کو تلاش کریں گے اور اس کو ہلاک کریں گے۔''

اس روایت میں دجال کو تلاش کر کے ہلاک کرنے کا ذکر ہے جو شخص دجال کے قتل کی صراحت کرتا ہے۔ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

((يَقْتُلُ ابْنُ مَرْيَمَ الدَّجَّالَ بِبَابِ لُدٍّ)) (سنن الترمذی'کتاب أبواب الفتن'باب ما جاء فی قتل عیسی ابن مریم الدجال)

''عیسیٰ بن مریم علیہ السلام دجال کو 'باب لُد' (اسرائیل میں ایک مقام کا نام) پر قتل کریں گے۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔(صحیح الترمذی : ٢٢٤٤)

اس روایت میں دجال کے 'باب لُد' پر قتل ہونے کے کیا معنی ہے؟ نظریاتی یا استدلالی قتل کا 'باب لُد' کے ساتھ کیا تعلق بنتا ہے؟ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

((كَأَنِّي أُشَبِّهُهُ بِعَبْدِ الْعُزَّى بْنِ قَطَنٍ)) (صحیح مسلم'کتاب الفتن واشراط الساعة'باب ذکر الدجال وصفته وما معه)

''گویا میں دجال کو عبدالعزیٰ بن قطن کے ساتھ مشابہت دے رہا ہوں۔''

اسی طرح بعض روایات میں مذکور ہے کہ مدینہ میں ایک شخص ابن صیاد کے بارے میں بعض صفات کی بنا پر یہ تاثر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم میں پھیل گیا کہ وہ دجال ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے قتل کی اجازت چاہی:

فَقَالَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ دَعْنِي يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَضْرِبُ عُنُقَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم: ((إِنْ يَكُنْهُ فَلَنْ تُسَلَّطَ عَلَيْهِ وَإِنْ لَمْ يَكُنْهُ فَلَا خَيْرَ لَكَ فِي قَتْلِهِ)) (صحیح البخاری، کتاب الجنائز'باب إذا أسلم الصبی فمات هل یصلی علیه)

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے اجازت دیں میں اس کی گردن اڑا دوں تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر یہ ابن صیاد وہی دجال ہے تو تو ہرگز اس پر قابو نہ پا سکے گا' اور اگر یہ دجال نہیں ہے تو اس کے قتل میں تیرے لیے کوئی خیر کا پہلو نہیں ہے۔''

قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صیاد کو دجال سمجھ کر قتل کرنے کی اجازت کے حوالہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ نہیں فرمایا کہ قتل دجال کا مطلب کسی شخص کو قتل کرنا نہیں ہے بلکہ یہ تو نظریے کا بذریعہ استدلال ذہنی قتل ہے' بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ کیا کہ اگر تو یہ وہی دجال ہے جس کا آخری زمانے میں ظہور ہونا ہے تو اس کو قتل کرنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقدر ہے۔

اس کے علاوہ بھی دسیوں روایات ہیں جو دجال سے' ربوبیت کے دعویدار شخص دجال اور قتلِ دجال سے اس کے حقیقی قتل پر صراحتاً دلالت کرتی ہیں' لیکن ہم طوالت کے خوف سے انہیں یہاں نقل نہیں کر رہے ہیں۔امر واقعہ یہ ہے کہ مولانا وحید الدین خان صاحب نے مہدی و مسیح اور دجال کے بارے میں روایات کے الفاظ کی جو سطحی تاویلات پیش کی ہیں' ان کے سامنے روافض اور باطنیہ کی تاویلات ہیچ ہیں۔

تاویل کا بھی کوئی قانون اور ضابطہ ہوتا ہے۔ہر زبان میں تشبیہ و تمثیل اور مجاز و استعارہ موجود ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مجاز و تمثیل کے نام پر جس کا جو دل چاہے' مفہوم بیان کر دے۔قرآن کی باطنی تفاسیر بھی مجاز و تمثیل ہی کے قبیل سے ہیں۔اسماعیلیہ ہوں یا قادیانی' روافض ہوں یا منکرین حدیث' یہ سب حضرات مجاز و تمثیل کے نام پر ہی اپنے باطل افکار قرآن سے ثابت کرتے ہیں۔

تشبیہ و تمثیل اور مجاز و استعارہ کی حدود کیا ہوں گی؟ اس کے قواعد و ضوابط کیا ہوں گے؟ اہلِ علم نے تو ان کو طے کر دیا ہے۔علم اصول فقہ میں 'قواعد لغویہ عربیہ' کی عظیم الشان بحث اور علم بلاغت میں 'علم بیان' کا موضوع یہی ہے۔ذیل میں ہم حقیقت و مجاز کی بحث کے حوالہ سے تین ضوابط بطور مثال بیان کرنا چاہیں گے کہ جن سے مجاز و تمثیل مراد لینے کی حدود کا کسی قدر تعین ہوتا ہے۔

١۔ کلام میں اصل 'حقیقت' ہے اور یہ ایک یونیورسل اصول ہے' یعنی ہر کلام سے مراد اس کا حقیقی معنی ہوتا ہے اور مجاز مراد لینے کے لیے دلیل یا قرینہ چاہیے اور جب تک کوئی دلیل یا ضابطہ یا قرینہ موجود نہ ہو تو مجاز مراد لینا جائز نہیں ہے۔

٢۔ کسی لفظ کا حقیقی معنی ایک ہی ہوتا ہے جبکہ مجازی معنی تو کئی ہو سکتے ہیں۔پس حقیقت مراد لینے کی صورت میں اختلاف رفع ہو جاتا ہے جبکہ مجاز مراد لینے کی صورت میں اختلاف پیدا ہوتا ہے کیونکہ ہر کسی کا مجازی معنی اپنا ہوگا۔پس حقیقی معنی کو مجازی معنی پر ترجیح حاصل ہے۔

٣۔ ایمانیات اور امور غیبیہ کے بارے میں کلام کا اصول یہ ہے کہ اسے حقیقی معنی پر محمول کیا جائے گا کیونکہ اس میں مجاز مراد لینے کی صورت میں یہ متعین نہیں ہو سکے گا کہ کس کے بارے میں کیا ایمان لانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے' اور جب یہی معاملہ مشتبہ ہو کہ کس پر کیا ایمان لانا ہے تو ایمان لانے کا تقاضا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ (جاری ہے)

امام حمّاد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ

(۸۷ھ ۱۶۷ھ)

عبدالرشید عراقی

حماد نام کے دو ائمہ کرام ہیں اور دونوں کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے:

(۱) حماد بن سلمہؒ ' ولادت ۸۷ھ۔ وفات ۱۶۷ھ۔ (زیرِنظر مضمون انہی سے متعلق ہے)

(۲) حماد بن زیدؒ ' ولادت ۹۸ھ — وفات ۱۷۹ھ۔

نام ونسب: نام حماد بن سلمہ اور کنیت ابوسلمہ تھی۔ آپ بنوتمیم کے غلام تھے۔[۱]

تحصیلِ علم: امام حماد بن سلمہ نے علوم اسلامیہ کی تحصیل کس شہر میں کی' اس بارے میں اربابِ سیر اور تذکرہ نگاروں نے کوئی تصریح نہیں کی۔ تاہم بعض تذکرہ نگاروں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حماد نے تمام علوم دینیہ کی تحصیل بصرہ میں کی۔[۲]

اساتذہ: امام حماد بن سلمہ کے اساتذہ کی فہرست طویل ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (م۸۵۲ھ) فرماتے ہیں:

''انہوں نے تابعین کے ایک کثیر گروہ سے استفادہ کیا' اسی طرح ان کے بعد کے لوگوں سے بھی۔''[۳]

تلامذہ: امام حماد بن سلمہ کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے۔ چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

''امام شعبہ بن الحجاج (م۱۶۰ھ)' امام ابن جریج (م۱۵۰ھ)' امام عبداللہ بن مبارک (م۱۸۱ھ)' امام عبدالرحمٰن بن مہدی (م۱۹۸ھ)' امام یحییٰ بن سعید القطان (م۱۹۸ھ)' امام ابوداؤد طیالسی (م۲۰۴ھ)۔''[۴]

روایاتِ حماد بن سلمہ: حدیث کے تمام مجموعوں میں امام حماد بن سلمہ کی روایات موجود ہیں۔ خصوصیت سے امام ابوداؤد طیالسی نے جو ان کے تلمیذ رشید ہیں' اپنی مسند میں کئی سو روایتیں ان کے واسطے سے نقل کی ہیں۔

امام حماد بن سلمہ حدیث بیان کرنے میں بہت محتاط تھے۔ آخر انہوں نے ایک دن ارادہ

کرلیا کہ میں حدیث نبوی بیان نہیں کیا کروں گا۔ ایک رات انہیں خواب میں امام ایوب سختیانی جو امام حماد کے استاد تھے' ملے اور انہوں نے امام حماد سے فرمایا: ''تم احادیث روایت کیا کرو''۔ حافظ ذہبی (م۷۴۸ھ) نے امام حماد کا یہ قول نقل کیا ہے:

ما کان من نیتی أن احدث حتّٰی قال لی ایوب فی النوم حَدِّثْ[۵]

''حدیث بیان کرنے کا میرا ارادہ نہیں تھا' حتیٰ کہ امام ایوب نے مجھے خواب میں تحدیث کا حکم دیا۔''

ذریعۂ معاش: امام حماد کپڑے کا کاروبار کرتے تھے' مگر یہ کاروبار بھی محض رزقِ کفاف کے لیے تھا۔[۶]

علم وفضل: امام حماد بن سلمہ کے علم وفضل اور ان کے حفظ وضبط کا محدثین عظام اور اربابِ سیر و تذکرہ نگاروں نے اعتراف کیا ہے۔ حافظ ذہبی (م۷۴۸ھ) نے امام احمد بن حنبل (م۲۴۱ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''جس شخص کو حماد بن سلمہ کی برائی کرتے ہوئے دیکھو اس کے اسلام کو مشتبہ سمجھو''[۷]۔ حافظ ابن حجر (م۸۵۲ھ) نے امام ابن عدی (م۲۹۱ھ) کا درج ذیل قول اپنی کتاب تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے:

وحماد من اجلة المسلمین وهو مفتی البصرة وقد حدث عنه من هو اکبر منه سنا وله احادیث کثیرة اصناف کثیرة ومشائخ[۸]

''اور حماد نمایاں (اور عظیم) مسلمانوں میں سے تھے اور بصرہ کے مفتی تھے۔ ان سے ان کے سن رسیدہ لوگوں نے روایتیں بیان کی ہیں۔ ان سے بکثرت اور مختلف النوع احادیث مروی ہیں اور ان کے مشائخ کی تعداد بھی کثیر ہے۔''

زُہد وورع اور عبادت وریاضت: علم وفضل کے ساتھ ساتھ امام حماد بن سلمہ زہد وورع' تقویٰ وطہارت اور عبادت وریاضت میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ حافظ ابن حجر نے ان کے ایک معاصر عفان کا بیان نقل کیا ہے:

قد رأیتُ من هو أعبد من حماد بن سلمة ولکن ما رأیتُ اشدّ مواظبة علی الخیر وقراء القرآن والعمل للّٰه من حماد بن سلمة[۹]

''میں نے حماد بن سلمہ سے زیادہ عبادت کرنے والوں کو دیکھا ہے' مگر ان سے زیادہ تسلسل اور یکسوئی کے ساتھ بھلائی کرنے والا' تلاوتِ قرآن کرنے والا اور ہر کام اللہ تعالیٰ ہی کے لیے کرنے والا حماد بن سلمہ سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا۔''

حافظ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے امام ابن حبان (م ۳۵۴ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے:

''امام حماد بن سلمہ کا شمار مستجاب الدعوات عابدین میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے اقران میں فضل وکمال، دین وعبادت میں ممتاز تھے۔ سنت کے سخت پابند اور اہلِ بدعت کے اثرات کو ختم کرنے میں انتہائی کوشاں تھے۔''(۱۰)

امام حماد بن سلمہ نے پورے دن کو تقسیم کر رکھا تھا۔ درس وتدریس سے جو وقت بچتا اس میں تلاوتِ قرآن مجید کرتے یا تسبیحات پڑھتے رہتے تھے یا پھر نوافل میں مشغول ہو جاتے(۱۱)۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے اعمالِ صالحہ کی مقبولیت ہی کی یہ علامت تھی کہ ان کا انتقال مسجد میں بحالت نماز ہوا۔

مات حماد بن سلمة في المسجد وهو يصلي (۱۲)

''حماد بن سلمہ کی وفات مسجد میں بحالت نماز ہوئی۔''

استغناء، حق گوئی اور اُمراء کی صحبت سے گریز: امام حماد بن سلمہؒ کی کتابِ زندگی کا ہر باب بڑا تابناک ہے۔ ان میں سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ آپ استغناء کی صفت سے مالا مال ہونے کے ساتھ ساتھ حق گوئی اور بے باکی میں بڑے اعلیٰ وارفع مقام کے حامل تھے۔ علاوہ ازیں ان خصوصیات کے، آپ امراء سے ملاقات کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ حافظ ابن جوزیؒ نے اپنی کتاب ''صفوة الصفوة'' میں ان کا ایک واقعہ نقل کیا جس سے ان کی شانِ استغناء، حق گوئی و بے باکی اور امراء کی صحبت سے گریز کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ حافظ ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ:

''مقاتل بن صالح الخراسانی کا بیان ہے کہ میں ایک دن امام حماد بن سلمہ کے پاس گیا تو ان کے گھر میں ایک چٹائی کے علاوہ کچھ نہ پایا۔ وہ اسی پر بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے اور ایک چمڑے کا ٹوبڑا بھی اپنے پاس رکھا ہوا تھا جس میں ان کا سارا علم (یعنی روایات حدیث نبوی ﷺ) بند تھا۔ علاوہ ان کے ایک برتن تھا جس سے وضو کرتے تھے۔''

مقاتل بیان کرتے ہیں کہ:

''میں ایک دن امام صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ انہوں نے اپنی لونڈی سے کہا کہ دیکھو بیٹی کون ہے۔ وہ واپس آ کر بولی کہ محمد بن سلیمان (بصرہ کا امیر) کا قاصد آیا ہے۔ فرمایا اس کو جا کر کہہ دو کہ وہ تنہا میرے پاس آئے۔ چنانچہ قاصد آیا اور اس نے امیر بصرہ کا خط پیش کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ خط محمد بن سلیمان کی طرف سے حماد بن سلمہ کے نام۔

امابعد۔ خدا آپ کو اسی طرح سلامت رکھے جس طرح اس نے اپنے اولیاء اور اطاعت گزار لوگوں کو سلامت رکھا ہے۔ ایک مسئلہ درپیش ہے، اگر آپ تشریف لائیں تو اس کے بارے میں آپ سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔'' والسلام

خط پڑھ کر امام حماد بن سلمہ نے اپنی لونڈی سے فرمایا: قلم دوات لاؤ! اور اس خط کی پشت پر لونڈی سے یہ جواب لکھوایا:

اما بعد۔ آپ کو بھی خدا اسی طرح سلامت رکھے جس طرح اپنے دوستوں اور فرمانبرداروں کو سلامتی عطا کرتا ہے۔ میں نے بہت سے ایسے علماء کی صحبت اختیار کی ہے جو کسی کے پاس جایا نہیں کرتے تھے (اس لیے میں بھی معذور ہوں)۔ اگر آپ نے کوئی مسئلہ سمجھنا ہے تو آپ خود تشریف لائیں اور جو دریافت کرنا چاہیں دریافت کریں۔ اور ہاں، اگر آنے کا ارادہ ہو تو تنہا تشریف لائیے گا۔ آپ کے ساتھ خدم وحشم نہ ہوں، ورنہ میں آپ کے ساتھ اور اپنے ساتھ خیر خواہی نہ کر سکوں گا۔ والسلام''

قاصد یہ جواب لے کر واپس چلا گیا۔ مقاتل بن صالح بیان کرتے ہیں کہ میں ابھی بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ لونڈی سے فرمایا جا کر دیکھو کون آیا ہے۔ اس نے آ کر جواب دیا: محمد بن سلیمان تشریف لائے ہیں۔ فرمایا: ان سے کہہ دو تشریف لے آئیں مگر تنہا آئیں۔ چنانچہ محمد بن سلیمان اندر تشریف لائے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد گویا ہوئے کہ کیا وجہ ہے کہ جب بھی میں آپ کے سامنے ہوتا ہوں میرے اوپر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ امام حماد بن سلمہ نے یہ سن کر ثابت البنانی کے واسطے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ حدیث بیان کی کہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''جب عالم اپنے علم دین کے ذریعہ خدا کی خوشنودی چاہتا ہے تو اس سے ہر چیز ڈرنے لگتی ہے اور جب وہ اس سے دنیا کے خزانے چاہتا ہے تو وہ ہر چیز سے ڈرنے لگتا ہے''۔ اس کے بعد محمد بن سلیمان نے اجازت چاہی اور چالیس ہزار درہم پیش کیے اور عرض کیا کہ انہیں اپنی ضروریات میں صرف فرمائیں۔ امام حماد بن سلمہ نے فرمایا: ''مجھے ان کی ضرورت نہیں، ان کو لے جاؤ اور جن لوگوں پر ظلم کر کے انہیں حاصل کیا ہے ان کو دے ڈالو''۔ محمد بن سلیمان نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں یہ اپنے خاندانی ورثہ سے دے رہا ہوں۔ امام صاحب نے فرمایا: ''مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے

معاف کرو اللہ تمہیں معاف کرے‘ تم اس کو تقسیم کر دو‘۔ محمد بن سلیمان نے جواب دیا: میری تقسیم میں اگر کسی مستحق کو نہ ملا تو ناانصافی کی شکایت کرے گا۔ امام صاحب نے پھر یہی جواب دیا کہ مجھے معاف کرو۔‘‘(۱۳)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام حماد بن سلمہ کی زندگی کتنی درخشاں تھی اور وہ کس قدر زہد وورع کے پیکر‘ مستغنی‘ حق گوئی میں بے مثال اور اعلیٰ مرتبہ ومقام کے حامل تھے۔

تصانیف: امام حماد بن سلمہ صاحبِ تصنیف وتالیف تھے‘ لیکن ان کی تصانیف کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ صاحبِ شذرات الذہب نے صرف اتنا لکھا ہے:

له تصانيف في الحديث ’’حدیث میں ان کی تصانیف ہیں۔‘‘(۱۴)

حافظ ابن حجرؒ نے امام حماد بن سلمہ کے تلمیذ رشید امام ابوداؤد طیالسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

’’حماد بن سلمہ کے پاس قیس کی کتاب کے علاوہ کوئی دوسری کتاب نہیں تھی۔‘‘(۱۵)

وفات: امام حماد بن سلمہ نے ۸۰ سال کی عمر میں ۱۶۷ھ میں بصرہ (عراق) میں انتقال کیا۔(۱۶)

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حواشی

(۱) صفوۃ الصفوۃ‘ ج ۳‘ ص ۲۷۳۔
(۲) تبع تابعین‘ ج ۲‘ ص ۱۴۸۔
(۳) تہذیب التہذیب‘ ج ۳‘ ص ۱۱۲۔
(۴) تبع تابعین‘ ج ۲‘ ص ۱۵۰۔
(۵) تذکرۃ الحفاظ‘ ج ۱‘ ص ۱۸۳۔
(۶) شذرات الذہب‘ ج ۱‘ ص ۲۶۲۔
(۷) تذکرۃ الحفاظ‘ ج ۱‘ ص ۱۸۳۔
(۸) تہذب التہذیب‘ ج ۳‘ ص ۱۵۔
(۹) ایضاً‘ ج ۳‘ ص ۱۳۔
(۱۰) تذکرۃ الحفاظ‘ ج ۱‘ ص ۱۸۳۔
(۱۱) صفوۃ الصفوۃ‘ ج ۳‘ ص ۲۷۴۔
(۱۲) شذرات الذہب‘ ج ۱‘ ص ۲۶۲۔
(۱۳) صفوۃ الصفوۃ‘ ج ۳‘ ص ۲۷۴۔
(۱۴) شذرات الذہب‘ ج ۱‘ ص ۲۶۲۔
(۱۵) تہذیب التہذیب‘ ج ۳‘ ص ۱۵۔
(۱۶) تذکرۃ الحفاظ‘ ج ۱‘ ص ۱۸۳۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

مدارس قائم ہو گئے۔ جب انگریز ہندوستان پر قابض ہوا تو یہ ذہین وفطین قوم جس کا باطن شرارت اور خباثت کا شاہکار تھا‘ یہ جان گئی کہ ہندوستان کی مختلف اقوام میں سے مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو راکھ کا ڈھیر تو بن چکی ہے لیکن اس راکھ میں چنگاری موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس قوم کے پاس ایک نظریہ ہے جس کی بنیاد پر اقلیت ہونے کے باوجود اکثریت پر صدیوں حکومت کرتی رہی ہے۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے وہ پہلے ان کی غلام تھی اب ہماری غلام ہے‘ لہٰذا ہندوستان میں اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے مسلمانوں کو نشانہ پر رکھنا ہوگا۔ چنانچہ تلوار کے ذریعے ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی اور عسکری اقتدار کو ختم کرنے والے برطانوی سامراج نے مسلمانوں کو ذہنی غلام بنانے کے لیے اور نظریاتی سطح پر ضرب لگانے کے لیے قلم اور نظامِ تعلیم کو استعمال کیا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ یہ ضرب اتنی کاری تھی کہ ہند کے مسلمانوں کا جسد اور روح بڑی بری طرح گھائل ہوئی۔

تحریک پاکستان جس بنیاد پر چلی اور پاکستان جس انداز میں معرضِ وجود میں آیا‘ دوست تو دوست دشمن بھی سمجھتے تھے کہ ایک اسلامی ریاست کا قیام نظام تعلیم کو یقیناً نئے سرے سے دوبارہ صراطِ مستقیم پر گامزن کر دے گا۔ یعنی نظام تعلیم کا رخ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کی طرف موڑ دیا جائے گا اور نئی نسل کے اذہان وقلوب میں ہی نہیں رگ رگ میں قرآن وحدیث کی تعلیمات رچ بس جائیں گی‘ جس سے مؤمنینِ صادقین کی ایک ایسی فوج تیار ہوگی جو اندرونِ پاکستان ہی نہیں بیرونِ پاکستان بھی اسلام دشمن قوتوں کے دانت کھٹے کر دے گی اور عالمی سطح پر باطل نظام کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائے گی اور دوسرے اسلامی ممالک کی بھی اس حوالہ سے مدّ ومعاون ثابت ہوگی۔ لیکن وائے قسمت انگریز کی باقیاتِ سیّئات اسلام دشمنی کے حوالے سے خود انگریزوں سے بھی بدتر ثابت ہوئیں‘ یعنی حکمرانوں کا صرف رنگ بدلا سفید کی بجائے کالے حکمران آ گئے اور انگریز کے نافذ کردہ نظام تعلیم کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

صرف جنرل ضیاء الحق کے دور میں ایک جزوی سا کام ہوا اور سکولوں اور کالجوں کے تعلیمی نصاب میں قرآن کی بعض سورتیں جن میں جہاد وقتال کا ذکر بھی تھا‘ شامل کر دی گئیں اور نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے حوالے سے اخلاقیات کے عنوان سے بعض احادیث کو بھی طلبہ کے نصاب کا حصہ بنا دیا گیا۔ اگرچہ یہ ضرورت سے کم ہی نہیں انتہائی کم تھا لیکن بہرحال کچھ نہ

ہونے سے بہتر تھا۔ پھر بدقسمتی سے اس ملک پر ایک نام نہاد روشن خیال ڈکٹیٹر جو اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنا آئیڈیل بتاتا تھا‘ آئینی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے اقتدار پر قابض ہو گیا‘ جس نے حقوقِ نسواں جیسے رسوائے زمانہ قوانین بنائے۔ بہرحال وہ ایک نام نہاد روشن خیال اور مہا سیکولر اور متکبر انسان تھا۔ ہمیں اس سے خیر کی توقع بھی نہ تھی۔ لیکن جو بات ہم پر بجلی بن کر گری ہے‘ جس کے ثبوت حاضر و موجود ہونے کے باوجود ہمیں یقین نہیں آ رہا اور اپنی سماعت و بصارت پر شک گزر رہا ہے‘ وہ خبر یہ ہے کہ میاں شریف مرحوم و مغفور جو اسلام کے شیدائی تھے اور جب تک زندہ رہے عاشق رسول ہونے کے دعوے دار رہے‘ ان کے لختِ جگر مسلم لیگ (ن) کے سربراہ میاں نواز شریف کے برادر خورد پنجاب کے خادم اعلیٰ شہباز شریف نے پنجاب میں نویں اور دسویں جماعت کے نصاب سے سورۃ الانفال‘ الاحزاب اور الممتحنہ جیسی سورتیں‘ جو اکیس رکوع پر مشتمل تھیں‘ نکال کر ان کی جگہ قرآن پاک کی صرف دس عدد آیات شامل کی ہیں۔ پھر یہ کہ سلیبس میں سے پہلے بیس احادیث پر مشتمل ایک خوبصورت اور دل نشین گلدستہ موجود تھا‘ اسے نصاب سے خارج کر دیا گیا اور اس کی جگہ حدیث کا تعارف اور اقسام حدیث وغیرہ ایسا مواد شامل کر دیا گیا جو نونہالوں کے اذہان کو حدیث شریف کی دین میں اہمیت کے حوالے سے کنفیوز کرنے کی سعی معلوم ہوتی ہے۔

ہم اب بھی سمجھتے ہیں کہ شاید بے لگام اور آزاد منش بیوروکریسی نے اپنے لبرل ازم کے اظہار کے لیے یا اُس مرعوبیت کے تحت جو مغرب کے حوالہ سے اُن پر ہر وقت طاری رہتی ہے‘ وزیراعلیٰ سے بالا بالا یہ کارستانی کی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مشیر بے تدبیر نے سیکولر عناصر یا اپنے بیرونی آقاؤں کے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے دلائل کے انبار لگائے ہوں گے کہ عالمی بادشاہ گروں کے سامنے آپ کے سویٹ اور سوفٹ امیج کے لیے یہ سب کچھ کرنا ناگزیر ہے‘ لیکن اگر یہ خالصتاً آپ کا اپنا فیصلہ ہے کہ قرآن پاک کی ان سورتوں کو تعلیمی نصاب سے کھرچ دو اور احادیث کے خوبصورت گلدستہ کو نوچ ڈالو تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ عوامی جلسوں میں اسلام کے نعرے لگانا‘ امریکہ کو للکارنا اور کشکول توڑنے کے اعلان کرنا‘ اور عمل آپ کا یہ ہو کہ امریکی حکم پر جہاد و قتال کے حوالے سے قرآنی سورتوں کو تعلیمی نصاب سے نکال دیں‘ تو پھر آپ ہی بتائیں اسے کیا کہا جائے؟ ہم اسے محتاط ترین الفاظ میں بھی سیاسی شعبدہ بازی کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یاد رکھیے کہ اس قوم کا مذہب کے ساتھ بڑا جذباتی لگاؤ ہے۔ قرآن و

حدیث سے یہ ناروا سلوک آپ کو سیاسی سطح پر بھی مہنگا پڑے گا۔

آخر میں ہم آپ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ انسان خطا کا پتلا ہے اور شیطان اس کا ازلی دشمن ہے‘ بڑے بڑوں کو بہکا دیتا ہے‘ لیکن سمجھ دار آدمی وہ ہے جو اپنی غلطی کو تسلیم کرے۔ اگرچہ کسی بڑے عہدہ پر فائز کسی انسان کے لیے اپنے اٹھے ہوئے قدم کو واپس لینا بہت مشکل ہوتا ہے‘ لیکن یہی انسان کے لیے امتحان کے لمحات ہوتے ہیں کہ وہ عظمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رجوع کرتا ہے یا اپنی انا اور تکبّر کی وجہ سے ہٹ دھرمی اختیار کرتا ہے۔ ہم میاں شریف کے بیٹے سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ فوری طور پر رجوع کرتے ہوئے متعلقہ حکام کو حکم دیں گے کہ اس تبدیلی کو ختم کر دیں اور قرآن پاک کی وہ سورتیں اور احادیث کا وہ مجموعہ جو پہلے سے نصاب میں شامل تھا اسے بحال کر دیں۔ ہم آپ کی عظمت کو سلام کریں گے۔ اور اگر خدانخواستہ سیاست کی ڈالی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے مجبور ہو کر آپ ان احکامات کو واپس نہیں لیتے تو گویا آپ اپنی دُنیوی اور اخروی تباہی پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس حوالہ سے ضد اور ہٹ دھرمی شریف فیملی کی سیاست کو کفنانے اور دفنانے کے مترادف ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں انفرادی اور اجتماعی توبہ کرنے اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامنے کی توفیق بخشے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 15 روپے

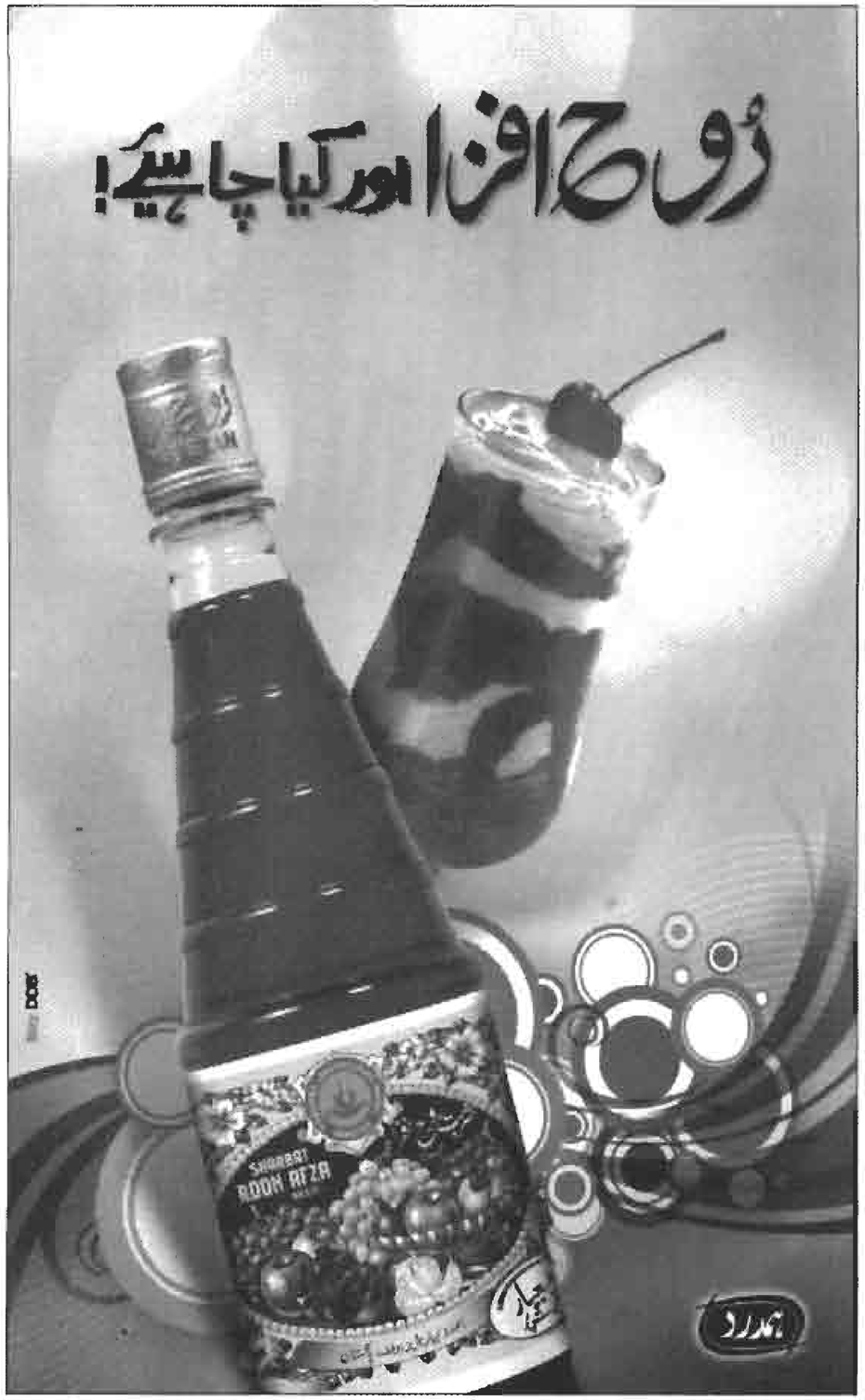

قرآن حکیم کی عظمت، تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

خود پڑھیے۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 400 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 250 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042
maktaba@tanzeem.org